بھرے بازار میں

حیات اللہ انصاری

مکتبۂ اردو لاہور

صدیقہ جاوید
۱۵. گرونانک پورہ ماڈل ٹ

بھرے بازار میں

حیات اللہ انصاری

مکتبہ اُردو لاہور

طبع اوّل
قیمت تین روپے

چودھری نذیر احمد پرنٹر پبلشرز نے تعلیمی پریس لاہور میں چھپوا کر مکتبہ اردو سے شائع کی

ترتیب

افسانے :-

'ق' کے نام

پہلی بات

افسانہ بھی آپ بیتی لکھنے کا ایک ڈھنگ ہے۔ یوں افسانہ لکھنے بیٹھو تو سیکڑوں باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے مضمون کی پابندی، اپنوں کا خیال، بہت سی باتیں کہنے میں جگ ہنسائی کا ڈر، اور سب سے بڑھ کر یہ ذمہ داری کہ جو بات کہو، نپی تُلی کہو۔ لیکن جب افسانے میں آپ بیتی لکھو تو ان سب پابندیوں سے چھٹکارا مل جاتا ہے کیونکہ وہاں تو "میں" سیکڑوں کرداروں میں بٹ جاتا ہے اور دل کے ارمانوں، امنگوں، حوصلوں اور غم و غصہ کو نکاسی کے بہتیرے راستے مل جاتے ہیں۔

ہم اوسط طبقے کے نوجوانوں کی بھی کیا زندگی ہے!! بچپن سے بہت سے ارمانوں، حوصلوں اور امنگوں کو دل میں چرا چرا کر پالتے آتے ہیں۔ پھر اسکولوں اور کالجوں کی فضا ان کو پروان چڑھاتی ہے۔ مگر جہاں پڑھ کر نکلے دُنیا اندھیر ملتی ہے اور سماج تنگ۔ کہیں ان ارمانوں کی، حوصلوں کی، اور امنگوں کی گنجائش نہیں۔ ہم لوگ چھوٹی سے چھوٹی آرزو پوری کرنے کے لئے ترسا کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ دل بلبلا کر پوچھتا ہے کہ یہ پہاڑ ہم پر کیوں ٹوٹ رہے ہیں؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اب ہم بپھر کر سماج پر پلٹ پڑتے ہیں اور اس بھید کی کھوج میں اس کی تہوں کو کُریدنے اور نوچنے لگتے ہیں۔

اب ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اگر ہم روٹی اور سکوں کے ترسے ہوئے ہیں تو ہم کو کروڑوں انسان نظر آتے ہیں جو ہماری طرح بلکہ ہم سے کہیں زیادہ ترسے ہوتے ہیں۔ اگر ہم پریم کے بھوکے ہیں تو ہم کو اس بھوک سے گھٹتے یا اس بھوک کے پورا کرنے کی سزا جھیلتے سیکڑوں نظر

اُٹھتے ہیں۔ قدرتی طور پر ہمارے جذبات ایسے انسانوں کے جذبات سے ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔ اب ہمارے ارمان، حوصلے اور اُمنگیں ہماری نہیں بلکہ سماج کی ہوجاتی ہیں۔ ہماری خود غرضی میں بے غرضی آجاتی ہے۔ اب ہمارا غصہ سماج کی اس بناوٹ پر، اور ان لوگوں پر جو اس بناوٹ کو سراہتے میں لگا رہتا ہے۔ ہم ایسے سماج کو جھنجھوڑنا چاہتے ہیں اور اس کے سراہنے والوں کے دلوں میں کچوکے لگانا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک راستہ افسانہ بھی ہے۔

زندگی کی کچھ تصویریں ہیں جن کو میں نے دور سے یا قریب سے دیکھا ہے اور ان کی تلخیوں اور مزوں میں ڈوب گیا ہوں۔ وہ تصویریں اگر ویسے ہی پیش کردی جائیں جیسے میری آنکھوں نے دیکھی ہیں تو میرے خیال میں وہ سماج کی بے تُکی بناوٹ کو اُدھیڑ ڈالتی ہیں اور اس کے سراہنے والوں کا مذاق اڑاتی ہیں۔ ایسی ہی تصویروں کے گلدستے میرے افسانے ہیں۔

سب سے بس دل چاہتا ہے کہ میری فریاد کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھیں۔ اس لئے زبان سہل کرنا پڑتی ہے اور اندازِ بیان سیدھا۔

یہ کام پڑھنے والوں کا ہے کہ وہ بتائیں کہ یہ تصویریں کہاں تک سچی ہیں؟ اگر سچی ہیں تو ان کی تائید کریں اگر غلط ہیں تو ان کی غلطیاں بتائیں۔ تاکہ ان کا ادب سیدھے راستے پر چلتا رہے۔

لکھنؤ

۱۵ر اگست ۱۹۳۵ء

حیات اللہ

پہلا حصّہ

(یہ حصّہ انوکھی مصیبت کے نام سے چھپ چکا ہے)

انوکھی مصیبت

کمزور پودا

ڈھائی سیر آٹا

ادا یا قضا؟

بھرے بازار میں

انوکھی مصیبت

ڈوبتے سورج کی کرنیں دور کے درختوں سے چھن چھن کر کھڑکیوں کے شیشوں سے گزرتی ہوئی کمرے میں آ رہی تھیں اور پھر بلور اور چینی کے برتنوں سے قوس قزحی رنگوں کو لیکر پیتل کے گملوں پر جو اونچی تپائیوں پر رکھے ہوئے تھے اور دیواروں کی تصویروں پر نقاشیاں کر رہی تھیں۔

احمد موسیٰ کلکٹر ضلع کے چاروں مہمان مسٹر ماتھر سول انجینیئر، مسٹر قریشی ہیلتھ آفیسر مسٹر نقوی ایم۔ایل۔اے اور جناب بیتاب صاحب ایڈیٹر اخبار "انڈین اوپنین" سامنے رکھی پر تکلف چیزوں کو مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔

ماتھر: "یار موسیٰ، تم اپنی پارٹیوں میں اتنی چیزیں منگوا لیتے ہو کہ انتخاب میں دشواری ہوتی ہے کیا کھاؤں اور کیا نہ کھاؤں"۔

قریشی: "ہاں اور خاص کر جب کھانے والے کا معدہ کمزور ہو اور طبیعت حریص"۔

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ کیونکہ ماتھر کو اکثر معدہ کی شکایت رہا کرتی تھی۔

مسٹر قریشی: "کیا بات ہے، آج لیڈیاں نظر نہیں آتیں؟"

مسٹر ماتھر: مسنر ماتھر کو اپنے نہ بلائے جانے کی بڑی شکایت تھی مگر ان کو اس بات کا علم نہ تھا کہ آج مسٹر موسےٰ نے ان کی جنس ہی سے بائیکاٹ کیا ہے

احمد موسیٰ: "میں نے قصداً نہیں بلایا۔ وجہ تم لوگ خود بوجھو"

مسٹر نقوی: "چلو کی پیالیاں کم پڑتی ہوں گی۔"

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

بلنیاب: "میں بوجھ گیا مگر آپ حضرات پہلے طبع آزمائی کر لیں۔"

مسٹر قریشی: "مسنر موسیٰ کی غیر موجودگی میں یہ لیڈیوں کو بلاتے ڈرتے ہیں۔"

مسٹر نقوی نے چھوٹتے ہی کہا:۔

"یہ ان کی غلطی ہے اس لئے کہ مسنر موسیٰ ان کی غیر موجودگی میں مردوں کو بلانا نہیں چھوڑ سکتیں۔"

پھر ایک قہقہہ پڑا۔

احمد موسیٰ: "مذاق میں اڑادینے کی سند نہیں وجہ بوجھو۔"

مسٹر نقوی: "بھائی میں ہار گیا۔"

مسٹر قریشی: "اور میں بھی۔"

بلنیاب: "کل ڈنر پر جب زندگی کی مصیبتوں کا تذکرہ چل نکلا تھا تو مسٹر موسیٰ کچھ کہتے کہتے رہ گئے۔ میرے اصرار پر چپکے سے کہنے لگے، پھر کسی موقعہ پر۔ آج شاید وہی موقع ہے۔"

احمد موسیٰ: "بات یہ ہے کہ قصہ ذرا عریاں ہے، اس لئے لیڈیوں کی موجودگی میں

کہنے والا نہیں۔ اس کے علاوہ اسے بے تکلف دوستوں ہی تک رہنا چاہیئے۔"
مسٹر نقوی:۔ "کہو کہو۔ مگر ناممکن ہے جو میری اُلٹی گو اہیاں گزرا ننے والے قصّے سے بڑھ جائے"
مسٹر قریشی:۔ "ارشاد:"

احمد موسیٰ:۔ "ان دنوں کا قصہ ہے جب مجھے ولایت سے آئے دو برس گزرے تھے اور جوائنٹ مجسٹریٹی سے ترقی پاکر ضلع . . . . کا کلکٹر ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں مجھے ایک مرتبہ دلی جانا پڑا۔ اس وقت میرے پاس والد صاحب کا پرانا کار تھا مگر خوب کام دیتا تھا اور اس واقعہ سے پہلے اس نے کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ میں نے سات بجے صبح اُٹھ کر مُنہ ہاتھ دھویا اور جلدی جلدی کپڑے پہن تیار ہو کار پر دلی روانہ ہو گیا اور دس بجتے بجتے نئی دلی پہنچ گیا۔ گیارہ تک کام سے فراغت ہو گئی۔ میری شامت جو آئی تو میں نے شوفر سے کہا۔ قطب مینار، لال قلعہ گھماتے چلو۔ خیال تھا کہ اس طرح بارہ بج جائیں گے۔ پھر کسی ہوٹل میں کھانا کھاؤں گا اور ڈیڑھ بجے تک گھر کی طرف روانہ ہو جاؤں گا چار بجتے بجتے پہنچ جاؤں گا۔ موسم خوشگوار تھا، یہی زمانہ ہوگا۔ اتنی سردی تھی کہ دھوپ ناگوار نہیں ہوتی تھی۔

اس دن اتفاق سے میں ضروریات سے فارغ نہیں ہو سکا تھا۔ اس وقت قطب مینار پہنچتے پہنچتے مجھے بے چینی سی محسوس ہوئی۔ مگر میں ٹالتا رہا۔ لیکن کچھ دور جا کر تکلیف بڑھ گئی۔ اب تو میں گھبرایا اور ادھر اُدھر خیال دوڑانے لگا کہ کوئی دوست شناسا ذہن میں آئے تو اس کے گھر پہنچ کر اس اذیت سے نجات حاصل کروں۔ نہیں تو پھر کسی معزز ہوٹل چلوں۔ اس وقت مجھے فاروقی یاد آیا۔ اس سے دل کو ذرا ڈھارس ہوئی میں نے شوفر کو ان کے مکان کا پتہ بتایا اور کہا:۔

"ذرا تیز چلو، مجھے باتھ لینا ہے۔"

میرا شوفر بیمار ہو گیا تھا، اس لئے میں نے ایک ڈپٹی کے شوفر کو بلا لیا تھا وہ نہ معلوم کیسا گنوار تھا کہ میری بات نہیں سمجھا اور نہ جانے کس راستے سے شہر کے باہر ہوتا ہوا چلا۔ موٹر تیز جا رہا تھا۔ اس لئے آس بندھی تھی اور ابھی تک معاملہ بھی قابو سے باہر نہیں ہوا تھا۔ موٹر ویرانے سے گزر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ لوگ جنگلوں اور کھیتوں میں کیسے رفع احتیاج کر لیتے ہیں۔ یہ ہندوستانیوں کی بد تہذیبی کی حد ہے۔ مگر یقین مانو کہ جس وقت اذیت زیادہ ہوتی تھی، میرا بھی یہی جی چاہتا تھا کہ موٹر رکوا کر وہیں کسی جگہ فراغت حاصل کروں مگر پھر سوچتا تھا کہ شوفر بھی کہے گا "بڑے صاحب" بھی کیا دیہاتی ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ منع کرنے پر بھی اپنے ڈپٹی سے کہہ دے تو پھر ضلع بھر میں جگ ہنسائی ہو۔

میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور میں ہر گڑھے اور ہر بڑے درخت کو اس نظر سے دیکھتا کہ اس کو کس کس رُخ سے اپنے کام میں لا سکتا ہوں۔ چلا جا رہا تھا۔ اپنی ڈھارس بندھا رہا تھا کہ اتنی جلدی ہمت ہار دینا ایک حاکمِ اعلیٰ، ایک "آئی۔ سی۔ ایس" کے لئے مناسب نہیں۔ خدا خدا کر کے موٹر شہر میں داخل ہوا اور ساتھ ہی ساتھ جسم بغاوت پر اتر آیا مگر میں نے بدن کو کڑا کر لیا اور دل ہی دل میں دہرانے لگا "کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے"، کیا ہے دوسرا مصرع؟

قریشی: "سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے"۔

احمد موسیٰ: "ہاں "سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے"۔ مجھے تو ایسا نظر آ رہا تھا کہ میری طبع لطیف اور نفسِ امارہ میں معرکہ درپیش ہے۔ اس میں شکست کھانے کے یہ معنی ہیں کہ مجھ میں اور ایک لونڈے انسان میں کوئی فرق نہیں اور مجھے اعلیٰ تعلیم سے کچھ

فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر استقلال سے کام لیا تو ضرور طبع لطیف کی فتح ہو گی جب ذرا دیر ہوئی تو میں نے شوفر سے پوچھا :۔

"کتنی دور اور ہے ؟"

"صاحب بیس منٹ کا رستہ اور ہوگا۔"

۲۰ منٹ ! افوہ یہاں جسم کے تشنج سے میں بوکھلا یا جا رہا تھا۔ میری جوانی کی رگوں ہی کا کام تھا جو اس پر قابو حاصل کئے ہوئے تھیں۔ اس وقت میں کسی ایسے خطّہ سے گذر رہا تھا۔ جہاں پولیس یا سکریٹریٹ یا کسی امداد ڈیپارٹمنٹ کی بارکیں بنی ہوئی تھیں میرا کئی دفعہ ارادہ ہوا کہ اتر جاؤں اور کسی سے مدد مانگوں۔ مدد ہی کیا ہے ایک لوٹا پانی اور ایک کنج تنہائی۔ پاٹ نہ میسر ہو نہ سہی۔ اگر کہیں میں اتر جاتا تو کام آسانی سے بنجاتا کیونکہ ایسے موقعوں پر لوگ بہت خوش ہوتے ہیں کہ چلو اسی بہانے کلکٹر صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ شاید ان سے کبھی سابقہ پڑجائے اور وہ بہت جوش و خروش سے کام کر دیتے ہیں مگر پھر ادنے درجہ کے افسروں سے ایسی گندی خواہش کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ کار تیز چل رہی تھی۔ اسی آس پر میں اپنی ہمت زندہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن ہر دو منٹ کے بعد مجھے حبس دم کی سخت ریاضت کرنی پڑتی تھی اور بڑی جدوجہد کے بعد کامیابی ہوتی تھی۔ شومی قسمت دیکھئے چوراہے پر بیل گاڑیاں گذر رہی تھیں۔ اس لئے پولیس مین نے میرا موٹر رکوا دیا اور رُکتے ہی وہ کمبخت فیل ہو گیا !!

قریشی و بیتاب ۔ فیل ہو گیا !!

احمد موسیٰ ۔ ہاں فیل ہو گیا۔ اب میری پریشانی کا خیال فرمائیے۔ اس وقت زندگی سے عاجز ہو رہا تھا۔ میں نے جھلا کر شوفر سے کہا :۔

جلدی دوڑ کر کوئی موٹر لانا۔ مجھے "ہاتھ" کی سخت ضرورت ہے

شوفر۔ حضور یہاں ٹیکسی کہاں۔ کہئے تو ایک تانگہ پکار لوں۔ آدھ گھنٹہ میں پہنچ جائیگا۔"

مجھے اُس کی بے عقلی پر غصہ آ رہا تھا۔ آخر واضح کر کے کہا۔

"استنجا کرنا ہے۔"

اب وہ کچھ سمجھا اور گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے ایک استنجا گھر بنا ہوا تھا جیسے میونسپلٹی کی طرف سے سڑکوں پر بنے ہوتے ہیں۔ اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا مگر چہرے پر خفگی کے آثار دیکھ کر بولا:۔

"صاحب، ایک بوتل خرید لوں۔ آپ موٹر ہی میں بیٹھے بیٹھے فارغ ہو لیں، مَیں پھینک دوں گا۔"

ذرا اس کی ناسمجھی کا خیال فرمائیے۔ کسی طرح بات سمجھتا ہی نہیں۔ آخر میں نے سوچا ڈپلومیسی کی ضرورت ہے۔ اس کمبخت کو دوست بنانا ہی پڑے گا۔ میں اپنے جسم کی رگوں اور پٹھوں پر جو اس وقت مصلحتاً بہت کس دیئے گئے تھے۔ قابو حاصل کر کے مسکرایا اور پھر کہا۔

"بوتل کی نہیں بیوقوف، مرتبان کی ضرورت ہوگی۔"

اب شوفر صاحب معاملہ کی تہ کو پہنچے اور ذرا مسکرائے۔ جی میں آیا تھا کہ دول اسی مُنہ پر ایک گھونسا۔ یہ مسکرانے کا موقع تھا، مگر صبر کیا اور کہا

"کوئی ہوٹل قریب ہے؟"

"حضور، ایسی خراب جگہ موٹر نے دغا دی۔ کوئی ہوٹل قریب نہیں۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"دیکھئے کوئی نہ کر کرتا ہوں"

وہ ادھر دوڑتا ہوا فکر کرنے گیا اور ادھر میں رانیں دبائے جسم بھر کی رگوں کو ستار کے تاروں کی طرح کسے بیٹھا تھا۔ یقین مانو جس وقت دورہ پڑتا تھا تو خدا یاد آجاتا تھا۔ بعض اتفاقات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت میونسپلٹی کی ایک گاڑی جاتی دکھائی دی ہائے کس حسرت سے میں نے اس کی طرف دیکھا ہے۔

اتنے میں شوفر بھاگا ہوا آیا اور بولا

"صاحب چلئے"

پہلے تو ایسا معلوم ہوا کہ تریاق آنے میں دیر ہوگئی۔ مگر قاعدہ ہے کہ کامیابی کا چہرہ دور سے دیکھتے ہی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ میں نے دنیا کے باہمت لوگوں کو یاد کیا۔ اپنی خاندانی عظمت کا خیال کیا اور دانت بھینچ کر موٹر سے اترا۔ شوفر میرے خیال سے آگے آگے تیز بھاگا مگر وہ بے عقل اتنا نہیں سمجھا کہ اس وقت میرے قویٰ اس قابل نہیں کہ تیز تیز قدم اٹھا سکوں۔ میں نے کسی نہ کسی طرح پوری دو گلیاں طے کیں اور جائے مقصود پر پہنچا مگر اس کو دیکھتے ہی جی میں آیا کہ ملعون شوفر کو مارے ٹھوکروں کے اڑا دوں۔ مجھے لیجا کر ایک بم پلس کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ مگر میں نے نرمی کا موقع دیکھ کر ضبط کیا اور کہا

"دوست کسی بھلے مانس سے باتیں کرو۔ اور اسی کے یہاں "رفع ضرورت" کا معاملہ طے کرا دو۔"

شوفر تھا گدھا لیکن معاملہ کی نزاکت سمجھ گیا اور مجھے وہاں سے ہٹا لایا۔ گلی میں پہنچکر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کچھ دور پر ایک صاحب بڑے سے کمرے کے سامنے اچھی سی شیروانی پہنے ٹہل رہے تھے، چھوٹی سی داڑھی تھی، عینک لگائے تھے۔ کمرے

پر بڑا اسائن بورڈ لگا تھا "مطب جناب حکیم . . . ." وہ معلوم کیا نام تھا اس گھبراہٹ میں کون پڑھتا۔ شوفر دوڑتا ہوا اُن کے پاس گیا اور میں بھی سیکڑوں مشکلوں سے پھونک پھونک کر قدم دھرتا اس کے پیچھے ہولیا۔

شوفر "جناب حکیم صاحب یہ ہمارے صاحب ہیں۔ ضلع . . . . کے کلکٹر ہیں۔ ان کا موٹر ٹرک پر کھڑا ہوا ہے۔ اس وقت بہت پریشان ہیں۔ کیونکہ 'رفع حاجت' کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔"

حکیم صاحب نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ان کے چہرے سے معلوم ہوا کہ میرے سوٹ اور ہیٹ سے رُعب کھا گئے ہیں۔ اب مجھے کامیابی کی اُمید بندھی۔ وہ بہت ادب سے شوفر سے کہنے لگے۔

"معلوم تو ہو کیا حاجت ہے، کیا شکایت ہے؟"

شوفر نے ان کی نافہمی دیکھ کر میری طرف دیکھا گویا اجازت مانگ رہا تھا کہ صاف صاف کہہ دوں، میرے چہرے کے پیچھے اس وقت اتنے کسے تھے کہ ان پر رضامندی، نارضامندی کسی قسم کے جذبات پیدا کرنا بالکل ہی ناممکن تھا۔ مگر وہ میری حالت زار دیکھ کر سمجھ گیا اور حکیم صاحب سے لجاجت سے کہنے لگا۔

"آپ کے یہاں ذرا بیت الخلا جانا چاہتے ہیں۔"

اے صاحب، ان کے تو تن بدن میں چنگاریاں لگ گئیں۔ گویا کہ شوفر نے کہہ دیا کہ آپ کی لڑکی بھگا لے جانا چاہتے ہیں۔

حکیم صاحب "ملعونو، بدمعاشو، غنڈو . . . ."

میرے پاس اتنا وقت کہاں تھا جو ان کی طلاقت لسانی کا جواب دیتا، انہوں نے

جو فرد جرم لگائی تھی اس کی صفائی پیش کرنا۔ حالانکہ چلنے کی سکت نہیں تھی تقدم قدم پر "ناموسی" کا خطرہ تھا مگر اسی حالت میں جیوں تیوں بھاگا۔ حکیم صاحب ایسے زوردار تھے کہ گالیاں دیتے دیتے گلی کے نکڑ تک آ گئے اور اس کے بعد بھی جتنا ہم لوگ دور ہٹتے جاتے وہ اپنی آواز اتنی ہی بلند کرتے جاتے۔ آگے آگے ہم لوگ اور پیچھے پیچھے انکی آواز۔ قیامت تھی کہ وہ کہہ رہے تھے۔

"بڑا کلکٹر بن کے آیا ہے۔ میرا گھر بم پولس ہے گویا۔ ارے میں تو ایسے کلکٹروں کو خوب پہچانتا ہوں"۔

راہگیر، دوکاندار ہم لوگوں کو حیرت سے تک رہے تھے۔ سچ کہتا ہوں مجھے اختلاج سا ہو رہا تھا اور رونا آ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کاش زمین پھٹ جاتے اور میں سما جاؤں حکیم صاحب پر ہزاروں لعنتیں بھیج رہا تھا۔ یہی ہے انسانی ہمدردی؟ اسی کا نام ہے اسلامی اخوت؟ جب قوم کی یہ حالت ہو کہ ایک بھائی کی ذرا سی مصیبت میں دوسرا شریک نہ ہو سکے اس پر جتنا ادبار نہ آ جائے تھوڑا ہے۔ آخر ہم لوگ حکیم صاحب کی زد سے نکل آئے یا پھر کوئی مریض آ گیا جس سے وہ خاموش ہو گئے۔ بہر حال ان کے ڈھنڈورے سے جان بچی۔ تب میں نے شوفر سے ذرا لجاجت سے کہا:۔

"میاں ایک دفعہ اور کوشش کر دیکھو، خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ ابکی کسی غریب مسلمان بھائی کی تلاش کرو اور اس کو یہ پانچ روپیہ کا نوٹ دے کر معاملہ طے کرا دو مگر برائے خدا یہ نہ کہہ دینا کہ میں کلکٹر ہوں"۔

شوفر میری حالت پر بے طرح ترس کھا رہا تھا۔ فوراً نوٹ لیکر ایک تنبولی کی طرف دوڑا۔ جو سامنے ایک چھوٹی سی دوکان پہ بیٹھا تھا۔ اس وقت میں حسرت سے

اپنے گھر کا صاف ستھرا "باتھ روم" اور اس کا چمکدار پاٹ یاد کر رہا تھا۔ کبھی کبھی والد کے گھر کا صاف ستھرا ہندوستانی وضع کا مقام یاد آتا۔ مگر وہاں تک پہونچنے کا خیال ہی بے سود تھا۔ وہ کہیں اور میں کہیں!

شوفر نے تنبولی سے پوچھا۔

"مسلمان ہو؟"

"جی۔"

"ایک کام کرو۔ پانچ روپیہ ملیں گے۔ صاحب کو اپنے گھر میں "رفع حاجت" کرادو۔"

"کیا؟"

اور تنبولی میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

شوفر: "ابے بیت الخلا۔ تیرے گھر میں بیت الخلا ہے۔ صاحب بیت الخلا تشریف لیجائیں گے"

تنبولی ملعون حکیم صاحب سے بھی بڑھ کر کمینہ نکلا۔ اُس نے پوری بات بھی نہیں سُنی تھی کہ مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر ہو گیا۔ ہم لوگ تھے کہ جواب کے منتظر کھڑے تھے اور اس کے مُنہ سے مارے ہنسی کے آواز ہی نہیں نکلتی۔ گویا ہم اس کے سامنے بھانڈوں کی نقل کر رہے تھے۔ دو چار خریدار بھی دکان کے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں سے بھی دو چار زور سے قہقہے لگانے لگے۔ کچھ پوچھنے لگے "کیا بات ہے؟ کیا بات؟"

یہ اور رسوائی۔ اب کہاں جاؤں۔ ہائے کیا مٹی پلید ہوئی! کہاں میں اور کہاں یہ حال! اس وقت یہ کیفیت تھی کہ دماغ تک کی رگیں پھٹی جا رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک آتش فشاں ہے جو اب پھٹا اور جب پھٹا۔ جی یہی کہتا تھا کہ جتنا انسان کر سکتا تھا کر لیا۔ اب اعلان شکست کر دو۔ گھر چل کر نہا لینا۔ لیکن قسمت اچھی تھی

اسی وقت ایک شخص جو جمعدار منٹ سے میرے برابر کھڑا تھا بلکہ شاید دیر سے ساتھ تھا۔ مگر میں نے اس کی طرف خیال نہیں کیا تھا، بولا۔

"جو دو، ادھر کچھ دور پر بڑا صاف بم پلس ہے میں ابھی ابھی جو رہی کی خاطر دو گھڑے پانی سے صاف کر کے آ رہا ہوں۔ جو رو ہیں چلیں۔ جو یہاں چھوٹے لوگوں سے کام تھوڑے ہی بنے گا۔ یہ دوکانوں کے رہنے والے ان کے گھر بیت الخلا کہاں؟ سب صبح کو بم پلس جاتے ہیں۔"

اس وقت بھنگی کی اس ہمدردی سے میری طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ ایک حکیم صاحب کو دیکھو، بلھون تنبولی کو دیکھو اور اس غریب بھائی کو دیکھو۔ پھر بھنگی ہماری خدمت کتنی کرتے ہیں اگر یہ لوگ کام نہ کریں تو ہمارے پاٹ کبھی صاف نہ ہوں۔ میں نے فوراً اس کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہو لیا مگر کن مشکلوں سے چلا ہوں۔ میرے قدم بہت چھوٹے چھوٹے اور گھوم کر پڑ رہے تھے۔ گویا میں کوئی ڈانس ایجاد کر رہا ہوں یا کسی کی اٹھلائی چال کی نقل اتار رہا ہوں۔ آخر کسی نہ کسی طرح اسی پہلے والے بم پلس کے سامنے پہنچ گیا۔ بم پلس کی قطع یہ تھی کہ ریل کی چھوٹی لائن کے ڈبوں کے برابر لوہے کا ایک ڈبہ تھا جس میں چھوٹے چھوٹے کئی خانے تھے۔ ہر ایک میں چھوٹے چھوٹے دروازے لگے تھے۔ نیچے سے کالے کالے ڈبے جھانک رہے تھے۔

اب تو ایسا معلوم ہوا کہ یہ جگہ درحقیقت اتنی بری اور گندی نہ تھی جتنی پہلی نظر میں معلوم ہوئی تھی۔ بھنگی نے پٹ کھول کر دکھایا تو اندر خاصا صاف تھا۔ میں نے سوچا کہ آخر جو لوگ یہاں جایا کرتے ہیں، وہ بھی آدمی ہی ہوتے ہیں۔ انسان انسان سب برابر ہیں۔ پھر میں کیوں نہیں جا سکتا ہوں۔ بھنگی بولا:۔

"جو بڑے لوگ بھی جب جرورت پڑ جاتی ہے تو یہیں جاتے ہیں۔ ہم لوگ کیا

کہتے پھرتے ہیں۔"

میں نے پتلون کی پٹی پر ہاتھ ڈالا۔ بیچارہ بھنگی دوڑ کر ایک صاف بدھنی میں پانی لایا اتنے میں تانگے کی آواز آئی اور شوفر صاحب اپنی کارگزاری دکھانے کو اس پر بیٹھے آپہنچے "صاحب ایک سرائے یہاں سے قریب ہے۔ مشکل سے پانچ منٹ کا راستہ ہوگا وہاں کا باتھ بہت صاف ہے۔ اس کی زمین پکی ہے۔ دیواروں پر تارکول پھرا ہوا ہے قلعی کئے ہوئے لوٹے میں پانی ملیگا اور آپ چاہیں تو گرم پانی بھی مل جائیگا۔"

جنت کی تصویر کیا اتنی دلفریب ہوگی جتنی اس وقت میرے باتھ کی تصویر تھی مگر وقت تنگ تھا۔ حالت بگڑ چکی تھی۔ نہ معلوم کن دقتوں سے چند سیکنڈ شوفر کی خطابت سُنی۔ مجھ میں آواز نکالنے کی تو سکت نہ تھی۔ دل ہی دل میں کہتا ہوا ع

"بعد مردن دولت قارون بھی ہاتھ آئی تو کیا"

—— اور کیا بتاؤں شوفر کی بات ادھوری چھوڑ، کس بے کسی سے ایک خانے کے اندر زن سے گھس گیا۔

ایک ہی منٹ کے بعد اندر سے پکار کے کہا

"وہ پانچ روپیہ کا نوٹ بھنگی کو دیدو۔"

کمزور پودا

پانی بھرتے بھرتے بغاطن نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پانی بھرنے والیاں دُور جا چکی تھیں صرف کنیز پاس تھی۔

"کنیزیا! تجھ سے ایک بات کہوں، خبردار زبان سے نہ نکالنا۔ ورنہ تیرا کچھ نہیں جائیگا میں مر جاؤں گی۔ تیرے بھلے کی کہتی ہوں"۔

کنیز کا دل دھک سے ہو گیا۔ معاً اُسے خیال گزرا کہ بغاطن نے شبیر میاں کو مجھ سے اشارے کنائے کرتے دیکھ لیا ہے ذرا گھبرائی ہوئی بولی:-

"کہو"۔

بغاطن گھڑا رکھ کر کنوئیں کی جگت پر بیٹھ گئی اور کنیز کو بھی اشارے سے بٹھا لیا

"شبیر میاں ۔ ۔ ۔ "

بغاطن رکی۔ پھر کھنکھار کر بولی۔

"شبیر میاں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ان کا کچھ نہیں جائے گا، تیری زندگی بگڑ جائیگی اور تیرے میاں باوا کا نہ معلوم کیا ہو؟"

کنیز کا رنگ اُڑ گیا جواب کیا دیتی۔ بفاطن سن میں اس کی ماں کے برابر تھی اور جو کہہ رہی تھی۔ اس کے بھلے کو کہہ رہی تھی۔

بفاطن تو یہ کہہ کر گھڑا اٹھا کر چلتی ہوئی۔ ذرا دیر کے بعد کنیز نے بھی گھڑا بغل میں دبا لیا اور گھر کی طرف چلی لیکن سوچ رہی تھی کہ شبیر میاں نئے کمرے کے نیچے سے گذرنا ہوگا اور وہ چھیڑ ضرور کریں گے۔ کنیز نے ابھی تک ان کی چھیڑ کا کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر پسند ضرور کرنے لگی تھی۔ یہی لالچ تھا جو اس کو اتنی سویرے کنوئیں پر لے جاتا۔ اگر کبھی شبیر میاں کمرے میں نہیں ملتے تو اس کا دل بجھ سا جاتا اور پھر دن بھر افسردہ رہتی۔ اکثر اس کا دل چاہتا تھا کہ شبیر میاں اور زیادہ چھیڑ کریں۔ میں دکھانے کو ناراض ہوں مگر وہ اس کی پرواہ نہ کریں۔

کنوئیں سے ہٹتے ہی زمیندار صاحب کا مکان تھا۔ راستہ کے برابر کندھوں تک اونچا چبوترہ تھا جس پر ایک بڑا سا مردانہ کمرہ تھا، دروازوں پر چقیں پڑی تھیں۔ اندر تخت بچھا تھا۔ اس پر صاف چادر تنی تھی۔ بڑی بڑی پھیلی پھیلی کرسیاں تھیں۔ کنیز سوچا کرتی تھی۔ کہ ان پر بیٹھنے سے بڑا سکھ ملتا ہوگا۔

کنیز کی آنکھیں چقوں پر جمی ہوئی تھیں اور سوچ رہی تھی کہ دیکھا چاہئے آج شبیر میاں کیا سوانگ نکالتے ہیں، کوئی فقرہ کستے ہیں، پانی پھینکتے ہیں یا ڈھیلا مارتے ہیں کہ اتنے میں پیچھے سے شبیر میاں تیزی سے آئے اور بڑی پھرتی سے اس کے گلے میں کوئی چیز لال رنگ کی ڈالی پھر اس کا منہ چوم، کود کر اپنے کمرے میں گھس گئے۔

صبح کی خنکی ابھی باقی تھی اور کنیز کے ہاتھ پاؤں بھی کنوئیں کے پانی سے بھیگے ہوئے

تھے۔ اس لیے اس کو کو ہلکی ہلکی سردی لگ رہی تھی مگر اس حادثہ سے اس کا سارا بدن بھبک سے جل اٹھا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں آگئیں۔ دل دھک دھک کرنے لگا اور آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اس نے گھبرا کر چبوترے کا سہارا لیا۔ گھڑا اس پر رکھ دیا اور پھر نیچی آواز سے کہنے لگی:۔

"شبیر میاں، لونڈیوں سے دل لگی اچھی نہیں۔ میں تو مٹ جاؤں گی۔ آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

نہ معلوم شبیر میاں کمرے میں تھے یا نہیں اور کنیز کی آواز انھوں نے سنی یا نہیں۔ کنیز نے حواس درست کئے اور گھڑا اٹھا کر گھر چلی ادھر اُدھر دیکھتی جاتی تھی کہ کسی نے دیکھا تو نہیں مگر ابھی سناٹا تھا کوئی راہگیر نہیں تھا۔ چبوترے کے دوسری طرف چھپر کے نیچے ایک آدمی بیلوں کو کھول رہا تھا مگر وہ آڑ میں تھا۔ یہ دیکھ کر کنیز کے دل کو ڈھارس ہوئی مگر شبیر میاں کی اس حرکت پر اس کو غصہ بہت آیا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا؟ لباطن نے کبھی نہ کبھی دیکھا ضرور، نہیں تو پتہ کیسے چلا؟ اتنے میں اس کی نگاہ اس کے گلے پر پڑی۔ دیکھا تو شیشے کا ترشا ہوا ایک ہار پڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بیر بہوٹی کے ایسے لال لال دانے تھے۔ بیچ میں ہر سنگھار کا ایسا ایک پھول تھا۔ چلنے سے اس میں لہر پیدا ہوتی تھی جس سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر کنیز کے دل میں بھی ایک لہر سی پیدا ہوئی۔ غصہ تو ویسا ہی رہا مگر ساتھ ہی شبیر میاں کی محبت بھی زور کر آئی۔ اس نے چپکے سے گھڑا ایک ہاتھ سے سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے ہار اتارا اور اس کو کمر میں کھونس لیا اور پھر گھر کے اندر چلی گئی۔

ماں چولھا لیپ رہی تھی۔ باپ پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ چھوٹا بھائی ممو مرغیاں کھول رہا تھا۔ کنیز نے گھڑا مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے سے چبوترے پر

رکھدیا اور بولی

"اب میں تڑکے سویرے پانی بھرنے نہیں جایا کروں گی"۔

ماں نے یہ سُنکر منہ بگاڑ لیا مگر کچھ بولی نہیں۔ باپ نے سنا تک نہیں۔ ممنو بولا۔

"اب میں سویرے سویرے مُرغیاں نہیں کھولا کروں گا"۔

یہ کہہ کر اُس نے مرغیوں کو کنیز کی طرف دونوں ہاتھوں سے ہشکا دیا۔

کنیز:۔ دیکھ ممنو۔ مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ میری ہر بات کی نقل کرتا ہے۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ممنو:۔ بڑی وہ بنی ہیں۔ میں کیا نقل کرتا ہوں۔ میں نے کوئی بات تم سے کہی؟

ممنو نے پھر مرغیوں کو ہشکا دیا۔ اب کی ایک مرغی پھڑپھڑا کر کنیز پر آ گئی۔

کنیز:۔ حرامزادہ۔ ٹھہر تو۔۔۔۔

ممنو فوراً گھر کے باہر بھاگ گیا

ماں:۔ یہ کیا ہے کنیز یا! تو ہر وقت ممنو کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ اس نے اتنا ہی تو کہا تھا کہ میں سویرے سویرے مُرغیاں نہیں کھولا کروں گا۔ اس میں کیا بُرائی ہے"

کنیز ممنو کی حرکت بیان کرتی مگر اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ رونا آ گیا چپکے سے چھپّر کے نیچے پلنگ پر لیٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔ ماں اُٹھی اور مرغیوں کو گھر سے باہر نکال کر دروازے بند کر لئے اور پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔ باپ ویسے ہی حقہ گڑگڑاتا رہا۔ بیچ بیچ میں کھانستا بھی جاتا تھا۔ ممنو باہر ہی تھا اور جب تک کنیز گھر میں تھی۔ اس کے لوٹنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ تھوڑا سا رو لینے کے بعد کنیز کے دل کی بھڑاس نکل گئی۔ اس نے چپکے سے کمر سے ہار نکالا اور اس کو بچھونے پر پھیلا دیا۔ اب شبیر میاں پر غصہ بہت کم ہو چکا تھا مگر یہ سوچ کر کانپ

جاتی تھی کہ اگر کوئی دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟ ماں باپ مارتے مارتے بھرا کیا حال کر دیتے اور گاؤں میں کتنی بدنام ہو جاتی مگر خیر اب کیا پروا کسی نے دیکھا تھوڑے ہے شبیر میاں کتنے اچھے لگتے ہیں! گورا گورا رنگ ہے۔ صاف صاف کپڑے پہنتے ہیں بال بہت درست رہتے ہیں۔ ان کے سفید پاؤں چپلوں میں کیسے اچھے لگتے ہیں۔ جب نیکر پہنے، بندوق ہاتھ میں لئے شکار سے واپس آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس گئے اور تمام خطروں سے بچ گئے۔ وہ سچ مچ محبت کرتے ہیں۔ ورنہ سویرے سویرے اُٹھ کر گھنٹوں انتظار میں کیوں بیٹھے رہتے۔ میرے ستانے کی کیا کیا تدبیریں سوچا کرتے ہیں! ایک بار انھوں نے پیالہ بھر سُرخ رنگ ڈال دیا تھا۔ میں کتنی گھبرا گئی تھی کہ اماں دیکھیں گی تو کیا کہیں گی! اور پھر کنوئیں پر دھونے گئی مگر وہاں پہنچتے پہنچتے رنگ اڑ گیا۔

کنیز نے ہار گلے میں پہن لیا اور کوٹھڑی کے اندر جا کر آئینہ دیکھنے لگی۔ یہاں ابھی اندھیرا تھا۔ اس لئے کچھ صاف نظر نہیں آیا۔ اتنے میں ماں کی آواز آئی۔

"زمیندار صاحب کے یہاں نہیں جائے گی؟ ابھی کوئی بلانے آتا ہوگا پھر گھر میں مار بھی پڑے گی!"

کنیز نے جلدی سے ہار اُتار کر کمر میں کھونس لیا اور باہر آئی۔ کوئلہ چبا کر دانت ملے پھر ایک ٹوٹی سی کنگھی جس کے آدھے دانے میل سے بند تھے طاق پر سے اُٹھا کر مانگ درست کی اور زمیندار صاحب کے یہاں چلی۔

اب اس کو دوسری فکر دامنگیر ہوئی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شبیر میاں ڈیوڑھی میں چھپے ملتے اور اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے، گدگداتے اور گالوں پر ہاتھ مارتے اور پھر اپنے کمرے میں جس کا ایک دروازہ ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ گھس جاتے۔ اس کا غصہ

تو بجھ چکا تھا اور دل ہی دل میں اس خیال سے کہ شبیر میاں اس کے انتظار میں کھڑے ہو ں گے خوش ہو رہی تھی۔ بلکہ اب تو بوسہ کے خیال سے بھی اس کو مزا ملتا تھا مگر اس مزے میں ایک عجیب قسم کا ڈر ملا ہوا تھا۔ ایسا نامعلوم ڈر جو بچوں کو اندھیرے میں لگتا ہے مگر وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ زمیندار صاحب کی ڈیوڑھی سے گذرنا ہی تھا۔ کنیز پھاٹک تک تو آہستہ آہستہ گئی۔ وہاں پہنچنے پر ذرا رکی اور پھر زن سے دوڑ کر ڈیوڑھی پار کر گئی۔

زمیندار صاحب کی بہو۔ شبیر میاں کی بڑی بھاوج زچہ خانے میں تھیں۔ آج کل کنیز انہیں کا کام کرتی تھی۔ ان کی طبیعت میں حکومت بہت تھی۔ بات بات پر کنیز کو ڈانٹا کرتی تھیں۔ اکثر ذرا سی غلطی پر مار بھی پڑ جاتی۔ آج کونڈا صاف کرانے کے لئے دیر سے منتظر تھیں۔ کنیز کو دیکھتے ہی برس پڑیں۔ دور ہی سے ایک ڈانٹ بتائی۔ قریب آتے آتے پنکھا کھینچ مارا مگر نشانہ خالی گیا۔ اب کسی دوسرے حربہ کی تلاش ہوئی۔ تکیے، چادریں پاندان، پانی سے بھرا لوٹا سامنے تھا اور شاید لوٹے کی باری آتی مگر جوتیوں پر نگاہ پڑ گئی۔ ایک اٹھا کر کھینچ ماری جو اتفاق سے کنیز پر جا پڑی۔ اگر سیدھی نکلی چلی جاتی تو کنیز کی اور شامت آجاتی مگر اس پر بھی غصہ نہیں تھما کوسنوں کی بوچھار جاری تھی کہ شبیر میاں آ گئے، اُنہوں نے بھاوج کی اس فرعونیت پر دو چار فقرے کسے، جس سے وہ خاموش ہو گئیں اور کنیز کی جان بچ گئی۔

کنیز نے چپکے سے کونڈا اٹھالیا اور صاف کرنے چلی گئی۔ مگر نہ جانے کیوں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شبیر میاں اُسے گھور رہے ہیں۔ ایک مرتبہ کام کرتے کرتے اس نے دبی نظروں سے پیچھے دیکھا تو شبیر میاں سے نگاہیں چار ہو گئیں اور دونوں بے اختیار مسکرا دیئے۔ شبیر میاں فوراً دوسری طرف دیکھنے لگے۔ کنیز نے بھی جھینپ کے گردن جھکالی۔

کنیز کے دل میں اب اپنی قدر پیدا ہوگئی۔ وہ سوچتی تھی کہ شبیر میاں کے یہاں اتنی لونڈیاں اور ماماٸیں ہیں با ہر نوکر ہیں، چوکیدار ہیں۔ مگر وہ صرف میری ہی طرفداری کرتے ہیں، کتنے گھمنڈ کی بات ہے!"

رات کا کھانا کھلا کر کنیز جب گھر جانے لگی تو ڈیوڑھی کے قریب پہنچکر اس کا دل دھڑکا وہ دروازہ پر ٹھٹکی، اور صبح والی ترکیب عمل میں لانا چاہی مگر نہ جانے کیوں وہ دوڑنے سے باز رہی اور معمولی تیز رفتاری سے ڈیوڑھی کو ناگھنا چاہا۔ شبیر میاں جو دروازے کی اوٹ میں کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ فوراً اس پر جھپٹ پڑے۔ اس کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر چپکا دیئے۔ اس فوری حملہ سے کنیز بدحواس ہوگئی اور کھانا جو گھر لئے جارہی تھی ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ شبیر میاں کنیز کو گود میں اٹھا اپنے کمرے میں بھاگ آئے۔ کنیز نے ہاتھ پیر مارے۔ گڑگڑائی بُرا بھلا کہا چیخنے کی دھمکی دی مگر شبیر میاں تجربہ کار تھے۔ ان کی پکڑ مضبوط تھی۔ ساتھ ساتھ بے پناہ اظہارِ محبت اور گرما گرم بوسوں سے اُنہوں نے اس کے ارادے کو کمزور کر دیا۔ کنیز کے جسم میں برقی لہر دوڑ گئی۔ انجام کی تصویر دماغ کے سامنے دُھندلی ہوگئی۔ اُس نے اضطراراً آخری جدّوجہد کرنا چاہی مگر بےسود۔ وقت گزر چکا تھا۔ شراب کا ایک نشہ رگ وپے میں اُترتا جارہا تھا رفتہ رفتہ سرور و نشاط کا جسم و دماغ پر راج ہوگیا اور پھر اس نے خوشی خوشی اپنے کو طوفانی لہروں میں چھوڑ دیا +

(۲)

اس واقعہ کو ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ شبیر میاں کی چھٹیاں ختم ہوگئیں اور کالج کھُل گیا انہوں نے مختلف بہانوں سے ایک ایک دن دو دو دن جانے میں دیر کرنا شروع کر دی

ان کے والد دوسرے زمینداروں کی طرح معاملات سے بےخبر نہیں رہتے تھے۔ اسلئے ان کو کسی طرح کا دھوکا دینا ناممکن تھا۔ دو ایک دن تو شبیر میاں کو طرح دیتے رہے اور پھر اُنھوں نے شبیر میاں کو کوچ کا حکم سنا دیا۔

اسی رات کو کنیز شبیر میاں سے احاطے کے پچھواڑے ایک جگہ پر جو پہلے سے مقرر کر لی تھی ملنے گئی۔ شبیر میاں بہت پہلے سے بیٹھے راہ تک رہے تھے اس کو دیکھکر دھیمے سے بولے :۔

"کنیز یا"

"جی"

پھر کنیز نے کھانے کی پوٹلی کنارے رکھ دی اور شبیر میاں سے بھڑ کر بیٹھ گئی

کنیز: "ہماری ایک نشانی پاس رکھئے گا۔"

شبیر میاں: "کیوں نہیں"۔

کنیز نے ایک رومال شبیر میاں کو دیا اور بولی۔

"آپ کے قابل تو نہیں ہے"!

شبیر میاں نے غور سے رومال دیکھا۔ معمولی نین سکھ کا بنا ہوا رومال تھا۔ جس پر انگریزی میں بھدا سا "شبیر" سُرخ ریشم سے کڑھا تھا۔ شبیر تھوڑی دیر تک اس کو چاند کی روشنی میں جو درخت سے چھن چھن کر ہلکی ہلکی آ رہی تھی دیکھتے رہے۔ پھر بولے

"تو یہ تم نے بنایا"؟

کنیز: میں کیا بناتی؟ جی تو یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح سے خود بنانا سیکھ کر بناتی۔ مگر لونڈیوں کو کام دھندوں سے کہاں اتنی چھٹی . . . بنوایا ہے"۔

شبیر میاں "بنوایا ہے! ہائیں!!
کنیز "جی"
شبیر میاں "کس سے؟"
کنیز "آپ کو اس سے کیا؟ جس سے بنوایا ہے وہ کسی سے کہے گا نہیں"
شبیر میاں "تو بڑی گدھی ہے۔ پگلی کہیں کی۔ لونڈی پھر لونڈی، تجھے میری عزت کی ذرا پروا نہیں"
کنیز آنسو بھر کر بولی۔
"دوسرے گاؤں میں بنوایا ہے۔ بنانے والے کو بھی معلوم نہیں کہ یہ کس کیلئے ہے .... نہیں لیجئے گا"

کنیز شبیر میاں کی محبت میں سرشار تھی۔ وہ اس کے چھپائے نہیں چھپتی۔ اکثر دوسروں کے سامنے ایسی حرکتیں کر بیٹھتی کہ اگر ان کو کوئی ذرا خیال سے دیکھے تو ان دونوں کے تعلقات پر شک کرنے لگے۔ شبیر میاں کنیز کی حرکت پر بہت بھڑتے تھے اور انہی کے خیال سے کنیز اپنے کو امکان بھر سنبھالے رکھتی تھی۔ کنیز رفتہ رفتہ اپنے تعلقات کے غیر رسمی ہونے کو بھول گئی تھی۔ ہاں اگر کبھی شبیر میاں کی شادی کا تذکرہ آجاتا یا کوئی بڑا بوڑھا شبیر میاں کو دعا دیدیتا "اللہ کرے شادی بیاہ ہو" تو کنیز کا دل کڑھ جاتا اور اس وقت اس کو اپنے تعلقات کی ناپائداری کا احساس ہوتا اور بات بات پہ ٹھنڈی سانس بھرنے لگتی، مگر پھر شبیر میاں کے پاس آتے ہی سب کچھ بھول جاتی اس محبت کے کھیل نے اس کی زندگی میں جان ڈال دی تھی۔ جس کی وجہ سے کسی طرح کا رنج اس کے دل میں ٹھہرنے ہی نہیں پاتا۔

شبیر میاں نے آخر کنیز کا خیال کر کے رومال جیب میں رکھ لیا اور پھر بولے "کل صبح کو میں روانہ ہو جاؤں گا۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"تو بھی کیسی بچوں کی ایسی باتیں کرتی ہے۔ ہوگا کیا؟ میں دسمبر کی چھٹیوں میں پھر آؤں گا۔"

کنیز تھوڑی دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ شبیر میاں نے جب کچھ ڈھارس دینے کی کوشش کی تو وہ ان کے سینہ پر سر رکھ کر رونے لگی اور ان کے سمجھانے سے کسی طرح چپ نہیں ہوئی۔ بڑی مشکلوں سے انہوں نے سمجھا بجھا کر ڈانٹ ڈپٹ کر اور صبح ملنے کا وعدہ کر کے اس کو گھر بھیج دیا۔

شبیر میاں وہاں سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے پاس کے تال تک چلے گئے۔ یہاں مینڈکوں کی غائیں غائیں اور جھینگروں کی جھنجھناہٹ گونج رہی تھی۔ کیچڑ اور بھیگی گھاس کی بو ہوا میں پھیلی تھی۔ ساتویں تاریخ کا چاند ڈوبنے ہی والا تھا۔ درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے اور روشنی بھی مدھم تھی۔ اس منظر نے شبیر میاں کے دل کو ذرا سکون دیا۔ ورنہ ان کا دل بہت بے چین تھا۔ کیونکہ سرور کا دور گزر چکا تھا۔ اب نشہ کا اتار تھا۔ کچھ کنیز کی بے بسی کچھ اپنی عزت و آبرو کا ڈر، سب سے زیادہ بدمزاج باپ کی ناراضگی کا خطرہ ان کے دل میں ہیجان مچائے ہوئے تھا۔ ان کو اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا اور چاہتے تھے کہ اپنا قصور کسی نہ کسی کے سر تھوپ دیں۔ اس وقت ان کو اپنے چھوٹے بھائی کی انا یاد آ رہی تھی جو دو سال پہلے ان کی زندگی کا اہم ترین جز بن گئی تھی اور جس کے چلتر دل پر ان کی معصومیت بھینٹ ہوئی تھی۔ یہ اپنا سارا قصور اسی کے سر منڈھتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی، دُور سے کوئل کی آواز آ رہی تھی۔ شبیر میاں کا دل اس کی آواز کے ساتھ لہریں لینے لگا۔ انہوں نے جیب سے رومال نکال کر دیکھا۔ کنیز کی محبت زور کر آئی اور یہ سوچنے لگے کہ سچ پوچھو تو تمام قصور کی ذمہدار میری کنیز سے محبت تھی۔ اس محبت کا انجام یہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ کیا میں کنیز سے شادی کر لیتا؟ رہی محبت سو اب بھی میرے دل میں ویسی ہی ہے۔ شبیر میاں نے رومال چُوما سینہ سے لگایا اور پھر کنیز کے ساتھ وفادار رہنے کا عہد کیا۔

(۳)

کنیز بہت سویرے اُٹھ کر شبیر میاں کے کمرے میں گئی۔ مگر ان کو نہ پایا۔ بہت حیرت ہوئی۔ ڈیڑھ مہینہ کے اندر یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُنہوں نے وعدہ خلافی کی۔ کیوں نہیں آئے کیا بات ہے، کیا رومال کے معاملہ میں بُرا مان گئے؟

شبیر میاں اس ڈر سے نہیں آئے تھے کہ شاید پھر کنیز رونے دھونے لگے یا کوئی ایسی حماقت کر بیٹھے جس سے چھپی چھپائی بات کھل جائے۔ کنیز تھوڑی دیر تک راستہ دیکھتی رہی۔ اور پھر افسردہ دل گھر چلی گئی۔

دس بجے شبیر میاں سامان واماں درست کر کے روانہ ہونے لگے۔ ماں بھاوج کو سلام کیا۔ اچٹتی ہوئی نظر کنیز پر ڈالی جو کھمبے سے لگی کھڑی تھی اور پھر باہر چلے گئے۔ کنیز آنکھ بچا کر ایک کوٹھری میں گھس گئی اور وہاں رو رو کر خوب دل کی بھڑاس نکالی۔

اب اس نے دسمبر کی چھٹیوں کا انتظار شروع کیا۔ ایک دن سے دوسرا دن ہوا، دوسرے دن سے تیسرا ہوا۔ ایک ہفتہ سے دوسرا ہفتہ ہوا۔ ایک مہینہ گیا۔ دوسرا

مہینہ گیا اور یوں ہی زندگی کٹنے لگی۔ وہی روزمرہ کا کام۔ وہی بیبیوں کی ڈانٹ، لونڈیوں کے طعن تشنیع۔ صبح کام کرنے آنا اور رات کو گھر واپس چلے جانا۔ پہلے اس کی زندگی کا رنگ ہی یہی تھا۔ اس لئے احساس بھی نہیں تھا مگر اب ایک بار جو زندگی کی لذت اٹھا چکی تھی تو اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ جنت میں داخل کی گئی اور پھر نکال کر پھینک دی گئی۔ اب کام بھی خراب کرنے لگی تھی۔ اس لئے بیبیوں کی توجہ بھی اس کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔

دو مہینہ کے بعد اس کی صحت میں نمایاں تغیر ہونے لگا۔ دُبلی ہو گئی اور چہرے پر زردی آگئی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے جو اس کو دیکھتا کہتا کہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ چپ ہو رہتی۔ ایک مہینہ اور گزرا اب ماں باپ کو اس کی بیماری کی طرف توجہ ہوئی۔ کنیز کا نکاح تو دو سال پہلے ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے بیماری کا رنگ بھانپتے ہی رخصتی کیلئے سلسلہ جنبانی کی۔ سسرال والے راضی ہو گئے مگر انہوں نے پانچ مہینے کی مہلت چاہی اور گیہوں کی فصل کٹنے پر رخصتی کی تاریخ مقرر کی۔ ادھر سے اور جلد رخصتی کرانے پر اصرار ہوا جس کو ان لوگوں نے بالکل نامنظور کر دیا۔

ایک مہینہ اور گزرا اور ماں باپ کی گھبراہٹ بہت بڑھ گئی۔ ہر ایک سے کہنے لگے کنیزیا کو جلندھر کی بیماری ہو گئی۔ جب لوگوں نے رائے دی کہ گاؤں کے ویدجی کو دکھا دو یا کوس بھر پر اسپتال ہے۔ وہاں لیجاؤ تو ان دونوں نے ٹال دیا۔ ہاں گنڈے تعویذ کرنے لگے۔ دو ایک دوائیاں بھی کھلائیں۔ آنیوالی مصیبت بانچھیں چڑھائے اپنے دانت دکھا رہی تھی مگر یہ دونوں اپنے کو دھوکے ہی میں رکھنا چاہتے تھے۔

کنیز کے لئے سب طرح مصیبت تھی۔ ماں طعن تشنیع کرتی۔ باپ سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ اگر کبھی دونوں میں سے کوئی ہمدردی دکھاتا بھی تو اس طرح کہ کنیز جھینپ جاتی۔

زمیندار صاحب کے یہاں ڈانٹ اور مار ان دنوں زیادہ ہو گئی تھی۔ ہاں اگر کوئی غمگسار تھا تو لطافت۔ اُس نے دو ایک دوائیاں بھی لا کر چھپا چھپا کھلائیں۔

کنیز خوش تھی۔ کیونکہ دسمبر کی چھٹیاں قریب آ رہی تھیں شبیر میاں آنے والے تھے اور اس کو یقین تھا کہ ان کے آتے ہی دُنیا بدل جائے گی اور خوشی پریشانیوں کی جگہ لے لے گی۔ کنیز اکثر لوگوں سے پوچھا کرتی کہ چھٹیاں کب شروع ہوں گی اور کب تک رہیں گی۔

ہوتے ہوتے چھٹیاں آ گئیں مگر کنیز کو حیرت تھی کہ شبیر میاں کی ماں اور بجائے اکی خلاف معمول ان کا انتظار نہیں کر رہی ہیں۔ اس کی وجہ تو پہلے اُس نے سمجھنا ہی نہیں چاہا لیکن جب دن گذرتے گئے اور شبیر میاں نہ آئے، تب خود ہی سمجھ گئی اور ساتھ ہی اس کا دل اندر ہی اندر ٹوٹتا گیا۔ آخر ایک دن شبیر میاں کی ماں کو یہ کہتے سُن لیا کہ ہم نے شبیر میاں کو لکھا ہے کہ یہاں نہ آؤ بلکہ اپنی بہن کے یہاں ہو آؤ۔

کنیز بہت بیمار رہنے لگی۔ زمیندار صاحب کی بیوی نے اس کی ماں کو بُلا کر پانچ روپے دیئے اور کہا کہ اس کا علاج کرو اور جب تک اچھی نہ ہو جائے۔ کام کاج کے لئے نہ بھیجو۔ کنیز اب گھر میں بیکار پڑی رہتی یا دو ایک چھوٹے موٹے کام کر دیتی۔ اس کی جلندھر کی بیماری تھی کہ روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ ماں سب دیکھتی تھی۔ سمجھتی تھی۔ ترس کھا کر چپ ہو جاتی تھی۔ باپ اکثر چلا اٹھتا تھا۔

"کبھی بڑے گھروں میں لڑکی نوکر نہ رکھی جائے"۔

ایک دن رات گئے کنیز کے ماں باپ، اپنے خیال میں اس کو سوتا پا کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

ماں :۔ "بھیا کے یہاں چلے چلو۔ بہت دن سے ہم لوگ وہاں نہیں گئے ہیں"۔

باپ :۔ "کیا خراب قسمت ہے، کھیتی کو دیکھوں کہ کیا کروں؟"

ماں :۔ "تم پہنچ کر چلے آنا"۔

باپ :۔ "کنیز جانے کے بھی قابل ہے؟"

ماں :۔ "جائیگی نہیں تو کیا کرے گی۔ بدنصیب کہیں کی"۔

باپ :۔ "منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھ"۔

کنیز سب سُن رہی تھی۔ اُس نے اُسی وقت طے کر لیا کہ کچھ ہو اپنے ناپاک وجود کو ماں باپ کے مکان سے ہٹا لیجاؤں گی۔ کہاں جاؤں گی؟ نہ اُس نے یہ سوال سوچا اور نہ سوچ سکتی تھی۔ رات بھر جاگتی رہی۔ جب اس کے خیال میں دو تین گھنٹہ رات رہ گئی تو آہستہ سے پلنگ سے اُٹھی اور دبے پاؤں کوٹھری میں چلی گئی۔ وہاں جلانے کی لکڑیاں اور کنڈے ڈھیر تھے۔ ان کو کونے میں ہٹا دیا اور ٹٹول کر ایک چھوٹی سی ہانڈی نکالی اس میں سے شبیر میاں کا دیا ہوا ہار نکالا اور گلے میں پہن لیا۔ پھر چپکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

کنیز کو وقت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ درحقیقت صبح ہو گئی تھی اور اب لوگ بیلوں کو لئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کنیز کو دیکھا اور پہچان کر کہا۔

"کہاں جا رہی ہے کنیریا؟"

کنیز گھبرائی، ہچکچائی، پھر بولی :۔

"وید جی کے یہاں۔ ابا کا جی نہیں اچھا ہے"۔

"وید جی ادھر کہاں ہیں؟ تالاب پار جا"۔

کنیز اسی طرف مڑ گئی۔ اس کیلئے تو سب سمتیں یکساں تھیں۔ تھوڑی دور جا کر اس نے خیال کیا کہ صبح ہو گئی ہے۔ تالاب پار بہت سے جاننے والے مل جائیں گے۔ اس لئے پہلے ہی والا راستہ بہتر ہے مگر جیسے ہی وہ پلٹی دیکھا کہ میرا رہبر کھڑا دیکھ رہا ہے۔ نہ معلوم راستہ بتانے کے لئے یا میرا ارادہ بھانپنے کیلئے۔ مجبوراً وہ جدھر جا رہی تھی اسی سمت چلی۔ کچھ دور جا کر اس کے علی الدی چچا آتے دکھائی دیئے۔ اس نے فوراً راستہ بدل دیا اور پگڈنڈی چھوڑ سڑک پر نکل گئی۔ ادھر سے بیل گاڑی آ رہی تھی۔ گاڑی کا پردہ چھوٹا ہوا تھا۔ صرف ایک کونہ اٹھا تھا۔ گاڑی خیراتی ہانک رہا تھا جو کنیز کے ساتھ کا کھیلا تھا۔ کنیز نے سوچا کہ اس کو اپنا دوست بنانا چاہئے۔ فوراً قریب جا کر خوشامد سے کہنے لگی۔

"خیراتی تو سڑک کو جا رہا ہے؛ مجھے بھی اپنے ساتھ لیتا چلتا۔"

"کہاں جائے گی؟"

"خالہ کے پاس اپنا علاج کرانے۔"

"اکیلی"۔

ہوں"۔

خیراتی معنی خیز تبسم سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور بولا۔

"ہوں، ہوں، ہوں"۔

کنیز کھسیا کر بولی

"اگر لے جانا ہو تو ویسا کہہ نہیں تو میں خود چلی جاؤں گی"۔

کنیز اس لئے گھبرا گئی تھی کہ اس کے علی الدی چچا قریب آ رہے تھے۔ بارے خیراتی اس کو گھبرایا ہوا دیکھ کر ترس کھا گیا اور بولا۔

"بیٹھ جا"

کنیز یا علی الدی چچا سے آڑ میں آکر بیٹھ گئی اور پردہ چھوڑ دیا۔ گاڑی کچّی سڑک پر کھسر کھسر کرتی چلنے لگی۔ علی الدی چچا برابر سے گذر گئے۔ کنیز کے دل کو اطمینان ہوا۔ اور وہ گاڑی کے ہچکولوں کا مزا لینے لگی۔ زندگی میں صرف دو تین بار گاڑی پر بیٹھی تھی۔ مگر کبھی مرتبہ اس طرح نہیں کہ پوری کی پوری گاڑی اسی کے لئے ہو۔ کنیز آرام اور اطمینان پاکر گاڑی میں لیٹ گئی اور پردے کا ایک کونہ اُٹھا کر جھانکنے لگی۔ خیراتی پوری آواز سے تانیں اڑا رہا تھا

"مٹ نہ جائے دردِ دل، مٹ نہ جائے دردِ دل"

گاڑی سڑک چھوڑ کر ایک باغ کے بیچ سے گزری اور اس کے بعد ایسے راستے پر چلنے لگی جس کے دونوں طرف اُونچے اُونچے ارہر کے جھنڈ کھڑے تھے۔ کنیز بچپن میں گاؤں کے ہر حصہ میں گھوم چکی تھی، اس لئے اس کو تعجب ہوا کہ خیراتی کدھر جا رہا ہے اور بولی۔

"کدھر جا رہا ہے؟"

خیراتی برابر تانیں مارتا رہا۔

"دردِ دل ہو، بھئی دردِ دل"

گفتگو کی گنجائش نہ پاکر کنیز خاموش ہو گئی۔ رات بھر کی جاگی تھی۔ اس لئے لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی مگر تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ اس کو ایک طرح کی بے چینی محسوس ہوئی اور آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو گاڑی اس کے دروازے پر کھڑی ہے اور خیراتی اُس کے ماں باپ سے باتیں کر رہا ہے۔

خیراتی: "اُتر نیچے بیگم صاحبہ۔ بہت اکڑ آگئی۔"

باپ ڈانٹ کر بولا۔

"کنیز ریا۔"

کنیز ڈر سے کانپتی ہوئی اُتری۔ اُترتے ہی باپ نے ایک گھونسا مارا اور پھر لکڑی اُٹھا کر چار پانچ ضربیں لگائیں۔ کنیز دروازے سے گزر کر انگنائی میں گر پڑی۔ باپ نے ایک لات رسید کی، پھر بھی غصہ کم نہیں ہوا۔ برابر گالیاں دیتے جا رہا تھا۔ آخر ماں کو ترس آگیا۔

"کیا مار ڈالو گے؟ وہ بچاری کرتی کیا؟ تم نے ہی اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ زمیندار کے مکان میں نوکر رہ کر آج تک کوئی لڑکی بچی ہے؟ ابھی پارسال بھندو کی بیوہ کے بچہ ہوا تھا.....؟"

"چُپ، اُدھر کئے جا رہی ہے۔ میں گاؤں میں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

پاس پڑوس کے مرد، اور عورتیں آ آ کر جمع ہو گئیں۔ قصہ ان لوگوں کو خیراتی سے معلوم ہی ہو گیا تھا۔ رہا سہا ماں باپ کی لڑائی سے معلوم ہو گیا۔ ہر ایک اپنی سی کہنے لگا۔

"بُرا کیا۔"

"بُرا کیا۔"

"بُرا ہوا۔"

"کہاں گئی تھی؟"

گئی ہی کیوں تھی؟ کوئی نکال رہا تھا۔"

"پہلے سے سوچ لیتی کہ ایسی بات کا پھل کیا ہوگا۔"

ماں باپ کا بُرا حال! ایک ایک کے سامنے دُکھڑا رو رہے تھے

ایک عورت بولی :-

"ایسی باتیں غریبوں کے گھر ہو ہی جاتی ہیں"۔

ایک دوسری عورت نے کہا :-

"عزت آبرو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں"۔

غل شور سنکر زمیندار صاحب کے گھر سے بفاطن خبر لینے آئی اور کنیز کے باپ سے پوچھنے لگی۔

"کیا بات ہے ؟"

"کیا بتاؤں شبیر میاں نے ہم لوگوں کی عزت لے لی اور اس حرامزادی کو تو کہیں کا نہ رکھا"

یہ سنتے ہی دو تین آدمی بول اُٹھے

"ہائیں ہائیں کسی کا نام کیوں لیتے ہو"

"کیا کہہ رہے ہو، کیا کہہ رہے ہو"

"کسی کا نام کیوں لو۔ اپنی قسمت کو کہو۔ قسمت کو"

ماں "ہاں اپنا لکھا"

ایک بڑھیا نے بفاطن کے پاس جا کر کہا۔

"یہ نہ کہدینا کہ ان لوگوں نے کسی کا نام لے لیا، کیا فائدہ ؟ جو ہونا تھا ہو چکا"

دوسری عورت "زمیندار صاحب کو خفا کر کے گاؤں میں رہنا ہو گا کیسے ؟"

تیسری عورت "دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر"

بفاطن چپکے سے چلی گئی جو جمع ہو گئے تھے۔ وہ بھی ایک ایک دو دو کر کے رخصت ہونے لگے۔ دو عورتیں ٹھہر گئیں۔ انہوں نے کنیز کو جو ابھی تک منہ ڈھکے بیکل پڑی رو رہی تھیں۔ انگنائی سے اٹھا کر اندر لے جا کر پلنگ پر لٹایا۔ چونیں بہت بے جگہ لگی تھیں۔ ان کو سینکا گیا۔ ہلدی چونا لگایا گیا۔ مگر کنیز کی بے چینی میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ زور سے چیخ اٹھتی۔ ان لوگوں کے کچھ سمجھ میں آیا، کچھ نہیں آیا مگر جو بن پڑا کرتی رہیں۔ آخر شام تک کنیز کے پیٹ سے آٹھ مہینہ کا ایک ننھا سا بچہ پیدا ہوا۔

(۴)

چار روز کے بعد کنیز کے ماں باپ گھر نمو پر چھوڑ منہ اندھیرے کنیز کو لیکر گاؤں سے چلے اور یہ ارادہ کیا کہ کنیز کو "مصلحتاً" کچھ دنوں کے لئے اس کی خالہ کے پاس پہنچا دینا چاہئے۔ پھر جیسا رنگ ہو ویسا کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کی رخصتی کی طرف سے تو اب بالکل مایوسی ہی ہو چکی تھی اور زمیندار صاحب نے بھی اعلان کر دیا تھا کہ میں ایسی خراب "عورت" کو گھر میں نہیں آنے دوں گا۔ سورج نکلتے نکلتے یہ لوگ ایک کوس نکل گئے۔ وہاں کسی شاہ صاحب کا مزار تھا۔ ان لوگوں نے جا کر دو پیسے چڑھائے ایک باباجی بیٹھے تھے پیسے پا کر دعائیں دینے لگے۔ ان کی نگاہ کنیز پر پڑی۔ دیکھا تو ایک نوجوان عورت گلے میں شیشے کا سرخ ہار پہنے ہے۔ دوپٹہ منہ کی طرف گھونگھٹ کی طرح لٹکا ہوا ہے اور اس کی گود میں ایک چوتہہ کپڑے پر ایک ذرا سا بچہ ہے۔ باباجی اس کی طرف دیکھ کر کنیز کے باپ سے کہنے لگے۔

"پوتا ہے کہ نواسہ؟"

کنیز غیرت کے مارے کٹ گئی اور اُس نے دوسری طرف مُنہ پھیر لیا۔ باباجی اس شرم کو دیکھ کر مسکرائے اور بولے

"پوتا ہے۔ اللہ اچھا رکھے۔ کما کر دادی دادا کا پیٹ بھرے۔"

تینوں مسافروں پر سناٹا چھا گیا اور وہاں سے چپ چاپ چل کھڑے ہوئے۔

پندرہ دن بعد جب ماں باپ کنیز کو پہنچا کر واپس آئے تو معلوم ہوا زمیندار صاحب کے یہاں شادی کے سامان ہو رہے ہیں۔ شبیر میاں کو قسمتوں سے بڑی مالدار بیوی مل رہی ہے

یہ دونوں ٹھنڈی سانسیں بھر کر گھر کے اندر چلے گئے۔

ڈھائی سیر آٹا

پروائی چل رہی تھی اسلئے مولا کو بائی نے پکڑ رکھا تھا اور وہ آٹھ دس روز سے کام پر نہیں جا سکا تھا۔ دو تین روز تک جو دو چار پیسے جمع تھے وہ خرچ ہوئے اور پھر اُدھار پر کام چلتا رہا۔ دو چار روز کے بعد بنیا بھی حیلے حوالے کرنے لگا۔ مجبوراً ایک دن مولا ٹانگ میں ذرا آرام پا کر صبح تڑکے ٹوکری لے کر مزدوروں کے بازار گیا۔ جن کاریگروں کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ اُن میں سے ایک نے جس کا کام لگا ہوا تھا۔ اُس کو ساتھ لے لیا۔ یہ دن بھر اینٹ گارا ڈھوتا رہا۔ شام کو ساڑھے چار آنے پیسے ملے جسے لیکر گھر چلا۔ راستے میں ایک آنہ بنیے کو قرضے کا ادا کیا۔ ایک آنہ مکان کے کرایہ کیلئے رکھ لیا اور ایک پیسہ کل کے چبینے کے لئے بچا لیا۔ باقی بچے نو پیسے اس میں سے ایک پیسے کے آلو۔ ایک کا باجرے کا آٹا۔ پانچ پیسے کے ڈیڑھ سیر چاول، اور ایک پیسہ کی دال، ایک پیسہ کی لکڑی لے کر ایک لمبی سی گلی میں گھس گیا جو آگے چل کر

اتنی تنگ ہوگئی تھی کہ وہاں ابھی سے اندھیرا تھا۔ اس گلی میں برابر کئی کئی کوٹھڑیاں بنی تھیں۔ دو ایک سے دھواں نکل رہا تھا جو ٹھنڈا ہو کر گلی میں بھر رہا تھا۔ ان میں سے ایک کوٹھڑی کے سامنے مولا کی بیوی منی جس سے شادی تو نہیں ہوئی تھی مگر پندرہ برس سے تعلقات میاں بیوی ہی کے ایسے تھے۔ دو لڑکیاں اور ان دونوں سے چھوٹے دو لڑکے جاڑے کے مارے پاس پاس بیٹھے مولا کا انتظار کر رہے تھے۔ سبھوں نے خوش ہو کر اس کو گھیر لیا۔ یہ تھکا ہوا بہت تھا۔ آتے ہی ٹاٹ پر لیٹ گیا اور پوٹلی رکھ کر بولا:۔

"سب لیتا آیا ہوں"

بیوی چولھے کے پاس گئی جو اسی کوٹھڑی میں ایک طرف بنا ہوا تھا آگ سلگائی اور دال چاول پکنے کو چڑھا دیئے۔ لڑکے اور لڑکیاں چولھے کو گھیر کر بیٹھ گئے اور دال پکنے کی دل خوش کن کھدر کھدر سننے لگے۔ ان لوگوں کیلئے اس سے بہتر اور کوئی راگنی نہیں ہو سکتی تھی۔

کمرے میں سیل اور میلے کپڑوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اب وہاں دھواں بھی بھرنے لگا۔ مگر سب کا دھیان چولھے کی طرف تھا۔ لڑکے بھوک سے پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ دال چاول جلد سے جلد پک جائیں۔ اس لئے وہ بار بار بہت سی لکڑی چولھے میں لگا دیتے۔ یہ دیکھ کر ان کی ماں ڈانٹ بتاتی۔

"کمبختو! کل کھانا کیسے پکے گا؟"

بڑی لڑکی جس کی پلکیں بال خورے نے غائب کر دی تھیں۔ چولھے کے پاس بیٹھی برابر بدن کھجلاتی جاتی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لکڑی کی ڈوئی سے دال اور چاول نکال کر چکھی سے ملتی تھی۔ اس وقت لڑکے پوچھتے تھے۔

"کتنی دیر ہے؟"

"بس تھوڑی دیر اور ہے"۔

یہی جواب آدھ گھنٹہ تک چلتا رہا۔ مولا ایک پرانی دری اوڑھے جس میں سیکڑوں چھید تھے۔ ٹاٹ پر چپ چاپ لیٹا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا

"جیسے نیند آ رہی ہے"۔

اتنے میں کسی کے چیخنے اور رونے کی آواز آنے لگی۔ کوئی مزدور تھا جو تاڑی پی کر اپنی بیوی کو مارتا تھا۔ جب غل غپاڑہ زیادہ ہوتا تھا تو آس پاس کے لوگ جا کر معاملہ رفع دفع کرا دیتے تھے۔ اس وقت یہ غل سُنکر منی بولی

"ان لوگوں کے ہاں روز روز یہی رہتا ہے۔ نہ معلوم کیسے کمینے ہیں"۔

مولا۔ ہونہہ —— چاول گلے نہیں اب تک؟

منی نے دیکھا تو چاول گل گئے تھے۔ اس نے اتار کر ایک طرف رکھدیئے۔ ہانڈی بند تھی مگر ابال میں ہانڈی کے کگروں پر کچھ چاول آ گئے تھے۔ چھوٹے لڑکے بو نے اس میں سے دو تین چاول پونچھ کر کھا لئے۔ دوسرا لڑکا منو فوراً بولا۔

"ہونہہ، میں بھی"۔

اس نے اور زیادہ کھا لئے۔ اس پر دونوں میں لڑائی ہونے ہی والی تھی کہ منی نے دونوں کو ڈانٹا۔

"کمبختوں میں ذرا صبر نہیں۔ میں کہتی ہوں ——"

تھوڑی دیر لڑکے منی کی بات پوری ہونے کے منتظر رہے۔ جب وہ کچھ نہیں بولی تو پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب دال کا سب کو بڑی بے صبری سے انتظار تھا

آخر ایک لڑکی بولی:-

"اماں اب گھونٹ دو۔"

ماں نے دال کو دیکھا تو وہ تھوڑی بہت گل گئی تھی۔ زائد انتظار کون کرتا۔ اس نے دال گھونٹ کر نمک ڈالا اور اتار لی۔ پھر تین تامچینی کی پلیٹیں جن کی چینی تقریباً بالکل اُڑ چکی تھی اور ایک مٹی کی رکابی سامنے رکھی۔ پہلے ایک بڑی پلیٹ میں چاول نکالے اور اس پر دال ڈال کر مولا کے سامنے رکھ دیئے۔ مولا بہت بیصبری سے کھانے لگا سب بچے اب ٹکٹکی باندھ کر منی کے ہاتھوں کی حرکت دیکھ رہے تھے۔ اس نے مٹی کی تھالی میں چاول دال نکال کر دونوں لڑکیوں کے بیچ میں رکھ دیئے اور پھر تامچینی کی پلیٹوں میں برابر برابر چاول نکالے، اس پر دال ڈالنے لگی۔

بھو۔ "منو کی پلیٹ میں اتنا اور ہماری پلیٹ میں اتنا۔"

منی نے تھوڑی سی دال اسکی پلیٹ میں اور ڈال دی۔

منو۔ "اماں ہم بھی۔"

ماں نے دو چار چاول اس کی پلیٹ میں بھی ڈال دیئے اور پھر باقی چاولوں کو دال کی ہانڈی میں اُلٹ کر کھانے لگی۔ ابھی چولھے میں کچھ کوئلے باقی تھے جن کی ہلکی ہلکی روشنی میں ان لوگوں کے چہرے اور چلتے ہوئے جبڑے دکھائی دے رہے تھے۔ چھوٹے لڑکے کھاتے جاتے اور پلیٹ کی طرف دیکھ کر اندازہ کرتے جاتے کہ ابھی اتنا اور ہے، اتنا اور ہے۔

آخر منو اپنی پلیٹ پونچھ کر بولا:-

"بس کھا چکے۔"

مولا بھی چاول ختم کر چکا اور بولا:-

"چاولوں میں خدا نے بڑی برکت دی ہے۔ ذرا سے کھائو تو پیٹ بھر گیا اور روٹی کا یہ ہے کہ سیر بھر آٹے کی ہو تو کچھ نہیں اور دو سیر ہو تو کچھ نہیں"۔

بہو۔" اماں! صبح کیا پکے گا؟"

اماں۔" میں کہتی ہوں ان لوگوں کی نیت کبھی نہیں بھرتی۔ ابھی کھا چکا ہے اور ابھی پوچھ رہا ہے کہ کل کیا پکے گا"۔

منی نے بانس کے پلنگ کے نیچے سے جو کوٹھڑی کا چوتھائی حصہ گھیرے ہوئے تھا۔ ایک پاندان نکالا جس کا پیندا گھس گیا تھا اور سب کٹھیاں ایک دفتی پر رکھی ہوئی تھیں۔ یہ پاندان منی کی ماں کا تھا اور اُس کو بہت پیارا تھا۔ وہ ہمیشہ سوچا کرتی تھی کہ میں کسی گھر میں اوپر کا کام کاج کرنے کو نوکر ہو جاؤں تو سب سے پہلے اسی کو ٹھیک کراؤنگی منی نے ایک پان کے چار ٹکڑے کئے۔ ایک خود کھایا۔ ایک مولا کو دیا اور دو دونوں لڑکیوں کو۔ پھر کوٹھڑی کے بیچ میں ایک ٹاٹ کا پردہ ڈال دیا جس سے اس کے دو حصے ہو گئے۔ ایک طرف پلنگ ہو گیا اور دوسری طرف ٹاٹ کا فرش۔ پلنگ پر منی اور مولا لیٹ گئے اور ٹاٹ پر دونوں لڑکے اور دونوں لڑکیاں۔ سردی تیز ہو گئی تھی۔ مولا اور منی نے تو وہی دری اوڑھ لی۔ لڑکوں اور لڑکیوں میں کسی نے موٹی چادر اور کسی نے ٹاٹ کا ٹکڑا اوپر اکر کے اوڑھ لیا اور پھر چڑیا کے بچوں کی طرح ایک دوسرے سے چپک کر لیٹ رہے۔ کوٹھڑی کے دروازے سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی، اس لئے مولا نے اُٹھ کر اس کو بند کر دیا۔ ہوا کی آمد و رفت بند ہو گئی اور کوٹھڑی میں حبس کی وجہ سے گرمی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد منی بولی:۔

"آج بختی بی پھر آئی تھیں اور کہہ گئی ہیں کہ نواب صاحب نے حکم دیدیا ہے

کہ جس پر کرایہ چڑھا ہو اس کو کوٹھڑی سے فوراً نکال دو۔"

مولا: "نکال دیں گے۔ نکال دیں گے۔ جب سنو، یہی ہے۔ آئیں، آ کر نکالیں۔ ہم جاڑوں میں بچوں کو لے کر کہاں جائیں۔ ہوا کریں وہ بڑے آدمی۔ ہم تو نہیں نکلیں گے کہدو جب کرایہ جمع ہو جائے گا۔ دے دیں گے۔ ضرور دے دینگے۔ مر جائیں تو بات دوسری ہے۔ بڑے آئے ہیں نکالنے والے۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموشی ہو گئی۔ پھر مولا بولا۔

"منشی جی کے یہاں کی نوکری کا پتہ چلا۔"

منی: "۔ وہ کہتے ہیں چھوٹی لڑکی سے میرا کام نہیں چلے گا۔ ایسی لڑکی ہو جو جھاڑو بہارو کرے اور دو گھڑے پانی اٹھا کے رکھدے۔"

اس کے بعد منی ذرا رک کر پھر آواز نیچی کر کے بولی۔

"میں کہتی ہوں کہ جوان لڑکی کو کیسے بھیجدوں۔ اس موتی کا بھی دیدہ ہوائی ہے۔ پانی بھرنے جاتی ہے تو ٹھٹھا کرتی ہوئی۔"

مولا: "جائے گی تو حرامزادی اپنے سے جائے گی۔ ایک چلی گئی تو کیا کر لیا؟ لڑکا ہوتی تو چار آنہ روز کما لاتی۔"

مولا کی بڑی لڑکی بھاگ گئی تھی اور سال بھر سے پتہ نہیں تھا۔

منی: "کر کیا لیا؟ موتی تھی ہی ایسی۔ ایسی نہ ہوتی تو جاتی کیوں؟ لڑکے کب اچھے نکلتے ہیں؟ کس نے لا کر ماں باپ کو کھلایا ہے؟ ادھر کمانے کے قابل ہوئے ادھر چل دیئے۔ بھورے کو دیکھو۔ ٹھیلہ چلاتا ہے۔ دس آنے روز پاتا ہے اور سب اڑا دیتا ہے۔"

منی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گئی اور پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ جس کو کبھی کبھی ان لوگوں کی کھانسی کی آواز توڑ دیتی تھی۔ ابھی آٹھ ہی بجے تھے۔ بازار میں چہل پہل تھی مگر یہاں سناٹا پڑ گیا۔

(۲)

جب مولا کی آنکھ کھلی تو اُس نے منی کو جاگتا پایا۔ وہ پانچ منٹ تک یونہی پڑا رہا پھر کراہتا ہوا اٹھا اور بولا:۔

"سردی کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔ بدن جیسے تختہ ہو گیا۔ بیڑی کہاں ہے؟"

منی نے اُٹھ کر ایک کونے سے ایک بیڑی کا بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیہ نکال کر دی۔ مولا نے ایک بیڑی سلگائی اور پینے لگا۔ بیڑی جب تک چٹکی سے پکڑنے کے قابل رہی اُس نے ہاتھ سے نہیں چھوڑی پھر پلنگ سے اٹھا اور لوٹا لے کر باہر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد سردی سے کانپتا ہوا اندر آیا اور لوٹا رکھ کر بولا:۔

"ایک بیڑی اور۔ اتنا دن چڑھ آیا۔ دھوپ کا پتہ نہیں"

مولا نے ایک بیڑی اور سلگائی۔ پھر لکڑی اٹھا کر بیڑی پیتا ہوا باہر چلا گیا۔

مولا کے جانے کے دو گھنٹہ بعد منی لڑکوں اور لڑکیوں کو لے کر باہر نکلی اور کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ تھوڑے ہی دیر میں دوسرے مزدوروں کی عورتیں دھوپ میں بیٹھ گئیں۔ بک بک کر رہی تھیں۔ بالک ان میں شریک ہو گئے۔ لڑکے اور چھوٹی لڑکی آنکھ بچا کر ادھر ادھر ہو گئے۔

تین چار گھنٹے کے بعد منو آیا اور ماں سے کہنے لگا:۔

"ماں رے! بھوک لگی ہے"

منی ویسے ہی باتوں میں مشغول رہی۔ گویا یہ سننے والی بات ہی نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے

بعد بو آیا اور اُس نے بھی اسی فقرے کو سنایا مگر منی نے اودھر بھی توجہ نہ کی۔ اس وقت وہ کسی شریف گھرانے کی عورتوں کی بد علیقی بہت جوش و خروش سے بیان کر رہی تھی۔ اس جوش میں یہ فخر پوشیدہ تھا کہ چھوٹی ذات سہی مگر میں ایسی نہیں ہوں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکا، یا دونوں کے دونوں اپنی صدا لگا دیتے۔ اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اب چھوٹی لڑکی بھی کہیں سے آئی اور ماں کے پاس بیٹھ گئی پھر چپکے سے بولی

"اماں چلو"

منی "ابھی سویرا ہے ذرا ٹھہرو"

دس منٹ اور گزرے اب تو بو ماں کا کندھا پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور رونی آواز سے رٹ لگا دی۔

"کھانا دو۔ کھانا دو۔ کھانا دو"

منی تھوڑی دیر تک یہ ریں ریں سنتی رہی۔ پھر اس کو ڈانٹ دیا جس پر بو بھوں بھوں رونے لگا۔ آخر یہ بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی۔

"میں کہتی ہوں، یہ سب غارت ہوں۔ یا میں غارت ہوں۔ زندگی دو بھر ہے"

منی نے کوٹھڑی میں آکر آگ سلگائی اور باجرے کے آٹے کی پانچ ٹکیاں پکائیں۔ دو چھوٹی اور تین بڑی، ان پر ذرا ذرا سا گڑ رکھ کر چھوٹی دونوں لڑکوں کو دیں اور بڑی ایک خود لی اور دو دونوں لڑکیوں کو دیں۔ ان لوگوں کا کھانا تین چار منٹ کے اندر اندر ہی ختم ہو گیا اور پھر یہ سب لوگ گھومنے نکل گئے۔

شام کو مولا جب مزدوری کے پیسے لئے پلٹ رہا تھا تو اُس کی نگاہ گلی کے کونے پہ پڑی۔ دیکھا تو دو ڈھائی سیر آٹا یوں ہی پڑا ہوا ہے۔ اُس نے قریب جا کر آٹے کو چکھا یہ

اُٹھا لیا۔ گویا یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ آنکھیں دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں۔ جب یقین آگیا تو متحیر کھڑا رہ گیا۔ دل کہتا تھا کہ اٹھائے چلو۔ مگر ایک تو یہ ڈر تھا کہ شاید کوئی کچھ کہے اور دوسری یہ جھجک کہ اس کے ساتھی مزدور بھی پیچھے آرہے ہوں گے۔ اگر وہ مجھے آٹا اٹھاتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ آخر اٹھانے کی ہمت نہیں پڑی اور یہ چل کھڑا ہوا مگر ہر قدم پر رفتار سست ہوتی جاتی... دس قدم چل کر بھونچکا سا کھڑا ہو گیا جیسے چوراہے پر پہنچکر راستہ بھول گیا ہو۔ سوچ رہا تھا کہ کوئی دوسرا مزدور اس آٹے کو ضرور اُٹھائے گا۔ مجھے نہیں ملے گا اور اس کو مل جائیگا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اتنا گہرا ہو گیا کہ مولا خیالی آٹا اٹھانے والے مزدور کو حد سے زیادہ رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگا اور یہ سوچتا ہوا آٹے کی طرف واپس آیا کہ بلا سے کوئی ہنسے تو ہنس لے۔ بیوی بچے تو آٹا پاکر خوش ہو جائیں گے۔ مولا کے قدم اتنی جوانمردی سے آٹے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گویا وہ کسی ڈوبتے لڑکے کو دریا سے نکالنے جا رہا ہے۔ آٹے کے پاس پہنچکر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اپنا انگوچھا بچھا دیا اور آٹا اُٹھانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔

"کیا لوگ ہیں! اناج اس طرح پھینک دیا۔ پیروں تلے اگر آئے، نالی میں لگ جائے، اس سے تو بہتر ہے کہ مرغی چرغی کھالیں۔"

جس بات کا ڈر تھا، وہی ہوئی۔ پانچ چھ مزدوروں کی ایک ٹولی پاس سے گذری اور یہ عجیب تماشا دیکھ کر تین چار مزدور کھڑے ہو گئے۔

ایک۔ کیا مل گیا مولا؟"

مولا۔ "کچھ نہیں۔ خراب آٹا ہے مگر ہے اناج۔ پیروں تلے آرہا تھا۔ میں نے کہا مرغی بکری کھالیں تو سوارت ہو جائے۔"

دوسرا:۔ کیا گلی کی پڑی ہوئی چیز! کہیں نظر گذر نہ ہو۔"

پہلا۔ اُٹھالے مولا، اُٹھالے۔ اس کو بکنے دے۔ کام آجائیگا۔"

مولا گردن جھکائے اپنے کام میں مشغول رہا۔ یہ لوگ چل کھڑے ہوئے۔ کچھ ہی دور پہنچکر ایک مزدور نے تان لگائی :۔

"سو سے بُرا تو ایک سے بہتر بنا دیا"

دوسرا اس کے تان ہی کی اثناء میں بولا :۔

"غریب ہی سہی، مگر ہم گلی سے گرا پڑا نہیں اُٹھاتے۔"

یہ مزدور بڑائی کی لے رہے تھے مگر حقیقت میں ان میں سے ہر ایک کو مولا کی خوش نصیبی پر کہ اتنا آٹا یوں ہی پڑا مل گیا رشک و حسد ہو رہا تھا۔

اس آٹے کا بھی عجیب قصہ ہوا۔

(۳)

دس بجنے کے قریب تھے مگر کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا تھا۔ شوکت میاں اسکول جانے کو تیار تھے۔ ان کی پھوپھی نے جلدی جلدی دو چار روٹیاں ڈلوادیں اور چار کباب تل دیئے۔ پھر جلدی سے ان کو میز پر چن، شوکت میاں کو کھانا کھانے کیلئے آواز دی، شوکت میاں ایک ہاتھ میں کتابیں لئے دوسرے ہاتھ سے شیروانی کے بٹن لگاتے کھانے کے کمرے میں گھس گئے اور بلا ہاتھ دھوئے کھانا شروع کر دیا۔ مگر پہلا ہی نوالہ منہ میں رکھا تھا کہ ایسا منہ بگاڑلیا گویا کونین پی گئے ہوں۔ جلدی سے وہ نوالہ پانی کے سہارے پیٹ میں پہنچادیا اور پھر روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا۔ چبایا اور پھر منہ بگاڑ کر بولے

"پھوپھی جان! آٹا خراب ہے۔"

"آٹا خراب ہے!! کیا؟"

"شاید اکرا گیا"۔

پھوپھی نے بھی روٹی کا ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا، پھر بولیں :-

"تمہاری باتیں!! اکرا گیا! کچھ روٹیاں جلدی پکنے سے دھواں گئیں"۔

شوکت میاں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ جلدی سے کتابیں اٹھا کر بھاگتے ہوئے باہر چلے گئے۔

بیگم صاحبہ دھوپ میں بیٹھی کچھ سی رہی تھیں۔ اپنے بیٹے کو اتنی جلدی کھانے کے کمرے سے نکلتے دیکھ کر بولیں :-

"کیا بات ہے؟"

شوکت میاں کی پھوپھی: "کچھ نہیں۔ ذرا روٹیاں دھواں گئیں"۔

بیگم صاحبہ :- "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شوکت میاں کب تک فاقے سے اسکول جاتے رہیں گے۔ ذرا روٹیاں میں تو دیکھوں!"

شوکت میاں کی پھوپھی ایک پلیٹ میں روٹی رکھ کر سامنے لائیں۔ بیگم صاحبہ نے ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا اور بولیں۔

"یہ دھواں گئی ہیں! میں کہتی ہوں بہن تم کو کب عقل آئے گی۔ اکرایا ہوا آٹا میرے بچے کے سامنے رکھ دیا۔ جہاں میں ذرا غافل ہوئی بس ولدہ دینا ہونے لگتا ہے"۔

اس فقرہ کا نشانہ پھوپھی تھیں۔ یہ بیچاری شوکت میاں کے باپ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ دس برس سے بیوہ تھیں اور ان کا یا ان کی لڑکی کا بجز اس گھر کے اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ بظاہر تو یہ ایک غریب بہن کی طرح رکھی جاتی تھیں۔ مگر حقیقت میں یہ صدر ماما" یا نوکروں

کے انچارج کی خدمات انجام دیتی تھیں اور ہر قسم کی بدنظمی کی براہِ راست ذمہ دار تھیں
بیگم صاحبہ کا الزام سُنکر بولیں۔

"اے میں نے تو بھلے کی سوچی تھی۔ چھوٹی مٹکی میں آٹا تھا میں نے کہا یہ کیوں پڑا
رہے کام ہی آجائے"۔

"یہ نہ ہوا کہ دیکھ لیتیں آٹا ہے کیسا؟ وہ تو روٹی کی صورت سے معلوم ہوتا ہے۔ خیراتن"
ان کی آواز پچیس گز کا فاصلہ طے کر کے اسی کڑک سے باورچی خانے پہنچی۔

خیراتن "جی بیگم صاحبہ ---- پکار رہی ہوں"۔

بیگم صاحبہ "سب آٹا نالی میں پھینک دے۔ بڑے گگرے سے آٹا نکال کر پکا"۔

شوکت میاں کی پھوپھی اس حکم کی تعمیل کرانے دوڑیں اور باورچی خانے میں آ کر
بڑبڑانے لگیں۔

"نالی میں پھینک دو۔ نالی میں پھینک دو۔ سچ ہے کہ جب چیز ہوتی ہے تو اس کی قدر
نہیں ہوتی۔ اناج بڑی چیز ہے بہن، بڑی چیز"۔

خیراتن "ہاں گندھا گندھایا آٹا۔ سب محنت اکارت۔

شوکت میاں کی پھوپھی "تم پھینکو ونکو نہیں۔ لیتی جاؤ بکری کو کھلا دینا۔ ہاں اور دیکھو
مٹکی میں ابھی ڈھائی دو سیر آٹا ہوگا۔ دو آنے دس پیسے کا مال ہے۔ وہ بھی تم لیتی جاؤ۔ میں
پھینکوا کر کیا کروں گی"۔

خیراتن چاہتی تو تھی کہ آٹا لیجائے مگر یہ دیکھ کر پھوپھی مری بچھیا برہمن کے نام کر کے احسان
کرنا چاہتی ہیں۔ بولی:-

"ہاں آٹا لے جا کر کسی کونے میں ڈال دوں گی۔ پیروں تلے نہ آئے۔ اب یہ کس کام کا"۔

پھوپھی نے اس ڈر سے زیادہ باتیں نہیں کیں کہ کہیں خیراتن آٹا لے جانے سے بالکل ہی انکار نہ کر دے اور اس طرح ذرا سا احسان کرنے کا جو موقع مل رہا ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ فوراً کوٹھری کے اندر جا کر آٹا اپنے ایک میلے دوپٹے میں باندھ لائیں اور بولیں :-

"ذرا دوپٹے کا خیال رکھنا۔ پھٹنے نہ پائے اور شام ہی کو اپنے ساتھ لیتی آنا"

خیراتن نے پوٹلی کی طرف ایک نظر ڈالی اور جیسے کام کر رہی تھی کرتی رہی۔ جب گھر جانے لگی تو پکی ہوئی روٹیاں۔ گوندھا ہوا آٹا اور آٹے کی پوٹلی سب سامان لیکر گھر آئی۔ خیراتن کی بڑی لڑکی نے، جو شوہر سے لڑائی ہونے کی وجہ سے مستقل ماں کے پاس رہتی تھی۔ اس سامان کا حال پوچھا۔ جب خیراتن نے قصہ بیان کیا تو اس نے۔ روٹی چکھی اور تھوک کر بولی۔

"کھانے کے قابل نہیں۔ کڑوا ہو گیا"

"بکری کھالے گی"

"اس کا دودھ گھٹ جائیگا"

خیراتن نے اٹھ کر روٹیاں بکری کے سامنے ڈال دیں۔ اس نے ایک روٹی تو کھالی مگر اس کے بعد منہ ہٹا لیا۔ پھر ان لوگوں نے لاکھ چمکارا مگر وہ ادھر متوجہ ہی نہیں ہوئی اور ہوتی کیسے، وہ تو بیگم کے یہاں کے بچے کچے مرغن کھانوں پر پلی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی پیٹ اسی سے بھرا تھا۔

اب خیراتن سوچ میں پڑ گئی کہ آخر آٹے کا مصرف کیا ہو۔ بیٹی نے تجویز پیش کی۔

"دو لاڑے کی نظر اتار کر چولھے پر ڈال دو"

یہ تجویز معقول تھی۔ اگر آدھ سیر تک آٹا ہوتا تو اس پر ضرور عمل کیا جاتا مگر اک دم سے

ڈھائی سیر آٹا اس طرح پھینکنے پر خیراتن کے دل نے گواہی نہیں دی
رات کو جب خیراتن کام کاج سے واپس آئی اور اطمینان سے کھانا کھا کر لیٹی تو یہ مسئلہ اٹھا کہ آٹے کا کیا ہو۔ دوستوں اور عزیزوں کی فہرست دہرائی مگر کوئی کام آتا شخص نظر نہ آیا۔ صبح ایک فقیر نے صدا لگائی۔ خیراتن نے موقع غنیمت جانا اور فوراً پاؤ بھر آٹا نکال کر بھیک دینے لگی۔ فقیر تھا شہر کا۔ آٹا دیکھ کر بولا۔

"مائی فقیر کو خراب چیز نہ دیا کرو۔ اللہ بھلا کرے۔"

یہ کہہ کر چلتا ہوا۔ خیراتن آٹا لیے بڑبڑاتی اندر آئی۔

"موئے، موٹے فقیر، بھیک مانگنے چلے ہیں۔"

اب پھر وہی مسئلہ۔ آٹے کا کیا ہو؟ سہ پہر کو ایک عورت دو بچوں کو ساتھ لیے ان کے گھر پہ آئی اور اس نے اپنی کتھا یوں سنائی۔

"میں کوئٹہ کی رہنے والی ہوں۔ زلزلے میں میرا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ میرے باغ تھے۔ بڑے بڑے مکانات تھے۔ شوہر اور لڑکے تھے مگر سب تباہ ہو گئے۔ میں دکھیا دربدر گھوم رہی ہوں۔"

خیراتن کو اور اس کی بیٹی کو ان تینوں کے حال پر بڑا ترس آیا اور سب آٹا اٹھا کر یکمشت ان لوگوں کو دے دیا۔ عورت غریب آدمیوں سے خلاف توقع اتنا آٹا پا کر متعجب ہوئی مگر عورت تھی۔ ان عورتوں کے خلوص میں اس کو شک ہوا۔ ذرا دور گلی میں جا کر اس نے پوٹلی کھولی اور جب حقیقت معلوم ہوئی تو خوب بڑبڑائی، کوسنے دیے اور آٹا گلی میں ڈال کر چلتی ہوئی اس کو خراب آٹے کی کیا پرواہ ہوتی؟ اس کی جیب میں آج کی تحصیل وصول کے روپیہ کھنک رہے تھے۔

(۴)

شام کے وقت منی مولا کا انتظار کر رہی تھی اور ببو اس کے کندھے سے لگا ریں ریں کر رہا تھا۔ "اماں بھوک لگی ہے، اماں بھوک لگی ہے"۔

منی :- "دوپہر کو تمہیں اور منو کو برابر کی ٹکیاں دی تھیں۔ دیکھو وہ کہاں روتا ہے"۔

منو ایک لال کنارے کا پھٹا کاغذ سر پر لپیٹے ایک لکڑی ہاتھ میں لئے سپاہی بنا ٹہل رہا تھا۔ یہ سنکر بولا۔

"اماں کل اور کم دینا۔ تب بھی ہم نہیں روئیں گے"۔

منی :- "اب بتا ببو۔ وہ دیکھو کتنا اچھا لڑکا ہے"۔

ببو غیرت میں آ کر خاموش ہو گیا مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر ویسی ہی ریں ریں کرنے لگا۔ اب منی کہنے لگی۔

"رو نہیں۔ دیکھو تمہارے ابا آتے ہوں گے اور تمہارے لئے چیز لاتے ہوں گے"۔

اتنے میں مولا آٹے کا پوٹلا لئے کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ منی نے پوٹلا کھولا اور دیکھ کر حیرت سے بولی :-

"گیہوں کا آٹا ——— کہاں ملا؟"

جب سے مولا بیمار تھا۔ ان لوگوں نے گیہوں کی روٹی تو نہیں کھائی تھی۔ اسے دیکھ کر سب خوش ہو گئے۔

مولا :- "مل گیا دیکھو کتنا ہے؟"

منی دوڑ کر کہیں سے ترازو مانگ لائی اور آٹا تولنے کیلئے بیٹھی۔ ایک سیر تولا اور اس کو ایک کپڑے میں رکھ دیا۔ پھر دوسری بار ترازو بھرا۔ نتیجہ دیکھنے کو سب انتہائی

ذوق و شوق سے منتظر تھے جیسے لڑکے اسکول میں امتحان کا نتیجہ سننے کے۔ آخر منی بولی:۔

"سوا دو سیر سے کم نہ ہو گا۔ کتنا اچھا آٹا ہے۔ چل چھوکری۔ دیکھ اس کے گھن چن۔ پہلے چراغ جلا۔ اندھیرا بہت ہے۔"

ایک لڑکی نے دوڑ کر ایک میلی سی لالٹین اٹھا کر جلائی اور پھر دونوں بیٹھ کر گھن چننے لگیں۔ دونوں چھوٹے لڑکے غل مچانے لگے۔

"گیہوں کا آٹا۔ گیہوں کا آٹا۔"

منی تھوڑی دیر چپ رہی پھر چلا کر بولی۔

"چپ رہو کمبختو، کان پھاڑے ڈالتے ہو۔"

اس کے بعد خاموشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک چھوٹی لڑکی کے کھانسنے کی آواز، بابڑی لڑکی کے بدن کھجلانے کی کھر کھر کے سوا اور کوئی آواز نہ آئی۔ ۵ منٹ بعد منی نے حکم سنایا۔

"بس اب صاف ہو گیا۔ آدھا آٹا کل کے لئے رکھ دو۔"

مولا۔ "اب رکھو گی کیا۔ آج ہی پکا لو۔ سب جی بھر کر کھا لیں۔"

دونوں لڑکے۔ "ہاں ہاں ـــ میری اماں۔"

منی آٹا گوندھنے لگی۔ آٹے میں اب بھی گھن موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کو کچھ شک ہوا۔ اس نے آٹا نکال کر چکھا۔ پھر ذرا منہ بنا کر بولی:۔

"نمک ڈال کر پکانے والا ہے۔ دو پیسے کا تیل لے آؤ تو آج پوریاں پکیں۔ دو پیسے کے آلو بھی لے آؤ ـــ ارے لڑکو، ذرا جا کر بقاتی کے یہاں سے کڑھائی تو لانا۔"

دونوں لڑکے بیتابانہ کڑھائی لینے دوڑے اور ان کے پیچھے چھوٹی لڑکی چلی۔ مولا بنئے

کے یہاں سامان خریدنے گیا۔ ذرا دیر میں لٹہ کی کڑھائی لیکر آپہنچی اور پیچھے پیچھے دونوں لڑکے چیختے ہوئے۔

"ہم لیجائیں گے، ہم لیجائیں گے"۔

منی نے کوٹھڑی کے باہر نکل کر کڑھائی مانجی۔ مولا لکڑی وغیرہ لے کر آیا۔ لڑکیوں نے آگ بنائی۔ سب لڑکے چولھا گھیر کر بیٹھے اور کڑھائی چڑھائی گئی۔ منی نے ایک مٹی کی رکابی میں ایک بڑی سی روٹی بڑھائی۔ کڑھائی میں دو قطرے تیل ڈالا۔ جب وہ کڑ کڑانے لگا تو اُس نے روٹی ڈالدی۔ وہ چر سے بولی۔ تیل کی بو کوٹھڑی میں پھیل گئی۔ لڑکے کھانسنے لگے، پوریاں پکتے دیکھ کر سب کے چہروں پر بحالی آگئی۔

منو "اہا ہا۔ کیسی اچھی خوشبو نکلی"۔

منی نے روٹی دوسری طرف اُلٹی۔

منو "کیسی لال لال۔ اماں یہ ہم کھائیں گے"۔

ببو "نہیں ہم۔ ہم"۔

منی نے پوری اُتاری۔ پھر کڑھائی میں دو قطرے ٹپکائے اور دوسری پوری ڈال دی۔ اسی طرح اُس نے ایک گھنٹے میں دھیمی دھیمی آنچ میں سب پوریاں نکال لیں۔ کھانے میں بہت دیر ہو گئی تھی مگر خوشی میں کسی کو محسوس نہیں ہوا۔ پوریاں پکا کر منی چلائی :-

"ارے آلو لاؤ۔ آلو لاؤ۔ کسی نے ابھی تک کاٹے ہی نہیں ابھی کھتی ہوں یہ چھوکریاں کسی کام کی نہیں۔ سب کھڑی تماشا دیکھ رہی ہیں"۔

جلدی جلدی آلو کے پتلے پتلے قتلے کاٹے گئے اور پھر کڑھائی میں پکنے کے لئے

چڑھا دیئے گئے۔ یہ انتظار بے شک کھل گیا۔ سب خاموش بیٹھے چوٹے کو تاک رہے تھے صرف کھانسی کی آواز خاموشی توڑ دیتی تھی۔ آخر آلو تیار ہو گئے۔ تیار کیا ہو گئے ذرا ملائم پڑ گئے منی نے مٹی کی رکابیاں نکالیں اور سب میں دو دو پوریاں اور ان پر تھوڑے تھوڑے آلو رکھ کر سب کے سامنے بڑھا دیئے۔ اب جوان لوگوں نے خیال کیا تو ببو سو رہا تھا

منی:۔ ببو اٹھ، اُٹھ، دیکھ پوریاں تیار ہو گئیں۔"

لڑکیاں:۔ اے ببو۔ ببو۔"

ببو آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا اور رونے کی نیت سے پورا منہ کھول کر ایک چیخ لگائی مگر ابھی چیخ پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس کی نگاہ پوریوں پر پڑ گئی۔ جن کو دیکھ کر رونا بھول گیا۔ سب ہنس ہنس کر پوریاں کھانے لگے۔

منو:۔ اہا ہا۔ کتنے مزے کی ہیں۔"

چھوٹی لڑکی:۔ اماں سالن ہوتا!"

بڑی لڑکی:۔ ہاں اور پلاؤ متنجن نہ ہوتا۔ گدھی۔"

پھر خاموشی ہو گئی۔ یہ لوگ مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔ جس سے اچھا خاصا شور پیدا ہو گیا تھا۔ جب پوریاں ختم ہو گئیں تو منی نے آدھی آدھی سب کو اور دیں اور پھر خود بھی لی۔ اب مولا نے آٹا ملنے کا قصہ بیان کیا۔ اس پر منی بولی یہ بھی خدا کی دین ہے۔ میں ببو سے کہہ رہی تھی کہ آج تمہارے ابا چیز لاتے ہوں گے

ببو:۔ اماں ہم گرما گرم پوری والے بنیں گے اور خوب پوریاں کھائیں گے۔"

منو:۔ ہم سپاہی بنیں گے اور سب کو پکڑ پکڑ کر جیلخانے بھجا کریں گے۔"

ببو:۔ ہم تم کو پوریاں نہیں دیں گے۔"

منو "ہم تم کو خوب پیٹیں گے اور پکڑ کر تھانے میں بند کر دیں گے۔"

ببو "ہم ـــــ ہم تم کو!"

ببو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ اس نے منو کا منہ چڑھا دیا۔ اس پر منو نے ایک گھونسا رسید کیا۔ مولا نے دونوں کو ڈانٹا۔

"کمبختو! آج تو خوب ٹھونس ٹھونس کر کھایا ہے، آج تو چپ رہو۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔ مولا بولا:-

"خدا ایسا ہی روز پیٹ بھرے۔"

جب یہ لوگ سونے لیٹے تو ببو بولا:-

"اماں، آج تو کہانی کہو۔"

لڑکیاں "ہاں ہاں ـــــ بادشاہزادے والی۔"

منی کی بھی آج طبیعت مگن تھی۔ وہ کہنے لگی:-

"ایک تھا بادشاہ ـــــ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ادا یا قضا

حکیم اعجاز حسین کے مکان کے سامنے والی گھنی نیم پر دھوپ پھیل چکی تھی مگر سورج کی کرنوں میں ابھی گرمی نہیں آئی تھی۔ درخت کے نیچے ایک تخت پر میلی سی چادر بچھی تھی جس پر کہیں کہیں پیک اور روشنائی کے دھبے تھے۔ صدر میں گاؤ تکیہ رکھا تھا جس کے سامنے حکیم صاحب کرتہ پائجامہ پہنے بیٹھے تھے۔ ان کا سن چالیس کے لگ بھگ ہوگا۔ داڑھی کے بال سفید ہو چلے تھے۔ تخت کے ایک کونے پر دیہاتی وضع کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ ایک اور آدمی تہمد باندھے نیم کی جڑ پہ بیٹھا تھا۔

حکیم صاحب چلم کے انتظار میں بار بار مکان کے دروازہ کی طرف دیکھتے تھے۔ دو منٹ میں چھیدو چلم لئے ہوئے نکلا۔ راستہ میں ایک کتا ٹانگیں پھیلائے لیٹا تھا۔ چھیدو نے چپکے سے ایک ڈھیلا اٹھا کے مارا۔ نشانہ پورا پڑا اور کتا پیں پیں کرتا بھاگا۔

چھیدو۔ ”جب دیکھو بیچ میں پڑا ہے، جب دیکھو بیچ میں پڑا ہے۔“

حکیم صاحب: "ابے چلم بھی لائے گا؟"

چھدو کے انداز سے ذرا بھی نہ معلوم ہوا کہ اس نے آواز سُن لی وہ اسی طرح خرام بلکہ نخرام پر عمل کرتا ہوا بڑبڑاتا ہوا آیا۔ حقہ ایک کنارے رکھا تھا۔ اس پر چلم رکھ کر حکیم صاحب کے سامنے کر دیا۔

حکیم صاحب: "میاں براتی! ذرا حقہ کی نبض تو دیکھنا۔"

میاں براتی جو تخت کے کونے پر بیٹھے تھے۔ بہت مستعدی سے آگے بڑھے۔ حقے آگے سرکا کر دو ایک کش لگائے۔ پھر چلم اتار کر زمین سے ایک لکڑی اٹھائی اور چلم کے نیچے ڈال کر توا اُچکا دیا۔ پھر مُنہ اُوپر اُٹھا کر چلم کے نیچے زور سے پھونک ماری۔ کچھ راکھ اور چنگاریاں اڑیں۔ کچھ ان کی داڑھی اور کندھے پر بھی پڑیں مگر انہوں نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور چلم حقہ پر لگا کر ایک لمبا سا کش کھینچا۔

اتنے میں ایک صاحب شرعی پاجامہ پہنے گزرتے دکھائی دیئے۔ حکیم صاحب نے پکارا "حافظ جی! کہاں؟"

حافظ جی گویا منتظر ہی تھے۔ آواز سنتے ہی پلٹ پڑے۔

حافظ جی: "ذرا لکھنؤ گیا تھا۔ عجب قہرِ خدا چھایا ہوا ہے۔ طاعون کا اندازہ ہے کہ ہزاروں لاشیں روز نکل جاتی ہیں۔ نہلانے اور دفن کرنے والے نہیں ملتے۔ آج کل تو بس شہدوں کی بن آئی ہے۔"

براتی: "اللہ رحم کرے۔ ہمارا قصبہ تو ابھی تک بچا ہوا ہے اور اللہ چاہے گا تو بچا ہی رہے گا۔"

حافظ جی: "کیا خاک بچا ہوا ہے؟ نتھو رات کو مر گیا۔ دو روز سے بخشی کی بیوی کو

بخار تھا۔ کل رات میں گلٹی دکھائی دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

حکیم صاحب: "کون بخشی؟"

حافظ جی: "وہی جو ٹھنگنا ٹھنگنا ہے۔ اکہ ہانکتا ہے۔ محرم میں علم اٹھاتا ہے۔"

حکیم صاحب: "ارے اس کی بیوی! خدا کرے اچھی ہو جائے۔ علاج کس کا کر رہا ہے؟"

حافظ جی: "خدا جانے۔ یہ لوگ کسی کی سنتے ہیں۔ میرے پاس تعویذ لکھوانے آیا تھا لکھ دیا۔ ۔ ۔ ۔ اماں براتی حقہ کیسا آ رہا ہے؟ ذرا ادھر بڑھانا ۔ ۔ ۔ ۔ حکیم صاحب ہم تو سمجھتے ہیں کہ کوئی بیماری ویماری نہیں۔ ہمارے ہی کرموں کا پھل ہے۔ سنا ہے کل بانو کی لڑکی بھاگ گئی۔"

حکیم صاحب: "اللہ کو یاد کرو۔ براتی وہ تعویذ لگ گئے؟"

براتی: "جی ہاں حکیم جی۔ ہندوؤں نے بھی مانگ مانگ کر لگائے مگر نور میاں نے اپنے یہاں نہیں لگانے دیئے۔"

حکیم صاحب خاندانی حکیم بھی تھے اور قصبہ کے مشہور بزرگ شاہ ولایت حسین صاحب کے مرید و خلیفہ بھی تھے۔ لکھنؤ اور پاس پڑوس کے مقامات پر طاعون کا زور سنکر انہوں نے نقش دافع طاعون چار پانچ سو کی تعداد میں لکھ کر قصبہ کے تمام گھروں میں لگانے کیلئے بٹوا دیا تھا۔ مگر نور میاں جن سے اور حکیم صاحب سے خاندانی چلی ہوئی تھی۔ اس نقش کے خلاف ہو گئے اور کہنے لگے۔

"وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ان ڈھکوسلوں سے کیا حاصل؟"

حکیم صاحب نے براتی کا جواب سنکر تاسف آمیز خاموشی اختیار کر لی۔

حافظ جی:۔ "یہ پھوڑٹ جونہ کرائے تھوڑا ہے۔"

براتی کوئی جواب دینے والا تھا کہ اتنے میں بخشی تیز تیز قدم اُٹھاتا آپہنچا۔

بخشی:۔ "سلام حکیم جی۔ گھر میں طبیعت بہت خراب ہے۔ طاعون ہو گیا ہے۔ کل تک دو دن کے اندر سات آٹھ دوائیاں پلائیں۔ صدقے اتارے۔ سرہانے بکرا باندھا۔ یہ حافظ جی بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کیلے کے پتے پر تعویذ لکھ دیا ہے۔ وہ گلے میں ڈالا۔ مگر کچھ فائدہ نہیں (ہاتھ جوڑ کر) اب حضور کے ہاتھ میں اس کی جان ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

حکیم صاحب:۔ "بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ گھبراتے کیوں ہو۔ اچھی ہو جائے گی۔ چھدو۔ گھر سے طاعون والے کشتوں کا صندوقچہ مانگ لاؤ۔"

چھدو لپکا ہوا ڈیوڑھی میں گیا اور زور سے آواز لگائی۔

"حکیم صاحب نے طاعون والے کشتوں کا صندوقچہ مانگا ہے۔"

یہ صدا سنتے ہی گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ ماما روٹی توے پر چھوڑ گھبرائی ہوئی ڈیوڑھی میں بھاگ آئی اور چھدو سے دس بارہ سوالات کر ڈالے مگر چھدو نے ان میں سے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ لڑکے آنکھ مچولا کھیل رہے تھے۔ حکیم صاحب کی بیوی نے ان کو بہت زور سے ڈانٹا۔ وہ سہم کر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب کی بیوی فوراً کہنے لگیں کہ میں بچوں کو لیکر کل ہی گوالیار اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤں گی۔ حکیم صاحب کی ماں اونچا سنتی تھیں۔ ہر ایک سے پوچھنے لگیں کیا بات ہے کیا بات ہے۔ کسی نے پاس جاکر چلا کر کہا کہ قصبہ میں طاعون پھیل گیا۔ یہ سنتے ہی چلا چلا استغفار پڑھنے لگیں۔

چھدو نے تھوڑی دیر کے بعد پھر پکارا:۔

"کشتوں والا صندوقچہ دے جاؤ"۔

ماما تو آواز سُن کر بڑبڑانے لگی

"دے جاؤ، دے جاؤ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میں ناحق پیدا ہوئی ایسے قصبے میں کبھی طاعون، کبھی ہیضہ، میرے ماں باپ حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ وہاں کبھی ایسی بیماریاں۔۔۔۔"

حکیم صاحب کی بیوی نے ڈانٹ کر بلایا اور ایک ٹین کا ڈبہ جس میں بہت سی پڑیاں اور شیشیاں تھیں اس کو دیا۔ وہ اسی طرح بڑبڑاتی ہوئی گئی اور چھدو کو دے آئی۔

چھدو بیٹھا تنکے سے زمین کرید رہا تھا۔ ڈبہ پاتے ہی بھاگا۔ حکیم صاحب نے ڈنڈا لیا اور بخشی سے بولے:-

"بسم اللہ چلو، اللہ چاہے گا تو دوا دینے ہی فائدہ ہوگا"

آگے آگے حکیم صاحب اور پیچھے پیچھے بخشی اور چھدو چلے۔ راستہ میں جو ملتا حکیم صاحب کو سلام کرتا اور بخشی سے یا چھدو سے پوچھتا کون بیمار ہے؟ بخشی ہر ایک سے کہتا جاتا دو ایک آدمیوں نے بخشی کو ڈھارس دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس مرض میں حکیم صاحب تو شرطیہ علاج کرتے ہیں۔

حکیم صاحب ایک ٹوٹے ہوئے مکان سے ہو کر جو اب مستقل راستہ ہو گیا تھا ایک کچے مکان کے پاس پہنچے۔ باہر چھپر پڑا تھا۔ اس میں ایک گھوڑا بندھا تھا۔ بخشی کے ساتھ حکیم صاحب اندر گئے۔

مریضہ پلنگ پر بیہوش لیٹی تھی۔ آس پاس بہت سے کپڑوں اور چیتھڑوں کا ڈھیر تھا پلنگ کے پایہ کے برابر چنے سے بھرا ٹوکرا رکھا تھا۔ بڑھیا ماں بیٹھی تھی۔ اُس نے فوراً حکیم صاحب

کے پاؤں پکڑ لئے اور گڑگڑا کر کہنے لگی

"حکیم صاحب! اپنے بچوں کا واسطہ اس کو جِلا لو۔ ہائے ننھے ننھے بچے ہیں۔ ان کا کوئی سہارا نہیں۔ میں کیا کروں کسی طرح یہ بچ جائے۔ یہ موئی بڑھیا مر جائے۔ صبح ذرا ہوش آیا تھا رو رو کر کہنے لگی۔ اماں! اب ہم مر جائیں گے۔ گھسیٹے اور بھورے تمہارے حوالے۔ پھر بولی حکیم صاحب کو بلا کر اور دکھا دو۔ زندگی ہوگی تو بچ جاؤں گی۔"

حکیم صاحب نے نبض دیکھی، قارورہ دیکھا پھر ایک پڑیا نکال کر ایک چمچے میں ڈالی، اس پر شہد ٹپکایا اور مریضہ کو چٹانے کے لئے ماں کو دی۔ دوا پہنچتے ہی ایک قے ہوئی۔ حکیم صاحب کود کر الگ ہوئے۔ ماں نے مریضہ کو سنبھالا۔ بخشی نے دوڑ کر راکھ لا کر قے پر ڈالی۔ دونوں بچے جو دور پر سہمے کھڑے تھے۔ ماں کی حالت دیکھ کر رونے لگے۔ قے کے بعد مریضہ کو کچھ ہوش آگیا اور کراہنے لگی۔ حکیم صاحب نے وہی دوا ایک پڑیا میں بخشی کو دی کہ شام تک چٹاتے رہو۔ گلٹیوں پر لگانے کی لیپ کا نسخہ لکھا اور یہ کہہ کر کہ "شام کو دیکھنے پھر آؤں گا، اس درمیان میں اگر طبیعت بگڑے تو حال کہنے فوراً آنا۔" حکیم صاحب چلے گئے۔

شام تک دوا اور مریضوں کی خبر آئی۔ حکیم صاحب دیکھنے گئے، نسخہ لکھا اور ضروری ہدایات دے کر چلے آئے۔ شام کو بخشی کے یہاں کا ایک پھیرا کیا۔ وہاں سے آکر کشتے اور دوائیاں تیار کرانے کا سامان کرنے لگے۔

(۲)

اس واقعہ کو ایک مہینہ ہوا۔ شام ہو رہی تھی مگر اب بھی حکیم صاحب کے مطب میں چھ سات ڈولیاں مریضوں کی رکھی تھیں۔ کچھ لوگ تھے حال کہنے آئے تھے۔ حکیم صاحب ابھی قصبہ کا چکر لگا کر واپس آئے تھے اور فوراً پھر مریضوں کے دیکھنے میں لگ گئے۔ کسی کو

نسخہ لکھ دیا۔کسی کو اپنے پاس سے دوا دی۔ اتنے میں تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا سفید کرتا اور ملا گجندنے کی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے مطب میں آیا۔ حکیم صاحب اس پر نظر پڑتے ہی چونک کر بولے:۔

"کیوں سلطان؟ خیریت ہے"۔

سلطان "دو دن سے بجیا کو بہت تیز بخار چڑھا ہے۔ اس وقت بالکل بیہوش ہیں اور برابر بک رہی ہیں"۔

حکیم صاحب "ٹھہرو، چلتا ہوں"۔

یہ کہہ کر جس مریض کو دیکھ رہے تھے اس کے بھائی سے بولے:۔

"کہاں رہتے ہو؟"

"مہنیا پار"۔

"بہت دور رہے، اگر چاہتے ہو کہ مریض اچھا ہو جائے تو ہمارے احاطے میں آکر ٹھہر جاؤ"۔ اتنے میں ایک آدمی دوڑا ہوا آیا اور بولا:۔

"حضور لڑکی کا حال بہت خراب ہے"۔

حکیم صاحب "سلطان! ذرا اس لڑکی کو دیکھ لوں۔ یہ بچارے اپنا گھر بار چھوڑ کر ہمارے یہاں آکر ٹھہرے ہیں۔ ذرا سی جگہ میں نہ معلوم کیسے بسر کرتے ہیں"۔

حکیم صاحب نے جلدی جلدی مریضوں کو دیکھا اور پھر لپک کر احاطے میں پہنچے۔ یہاں دو بڑے بڑے دالان تھے۔ جن میں پہلے بھینسیں بندھتی تھیں اور بیل گاڑی رکھی جاتی تھی کچھ بھوسا اور گھاس بھی رکھی رہتی تھی۔ اب بھینسیں تو طاعون میں مر چکی تھیں۔ گاڑی ایک کونے میں کھڑی کر دی گئی تھی اور سب سامان ہٹا دیا گیا تھا۔ دالانوں میں پردے پڑے

تھے۔ کسی طرف ٹٹر کھڑے تھے۔ ان میں آٹھ دس مریض مقیم تھے۔ جگہ بالکل اسپتال معلوم ہوتی تھی۔ کسی طرف سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ کہیں کوئی چلا رہا تھا۔ ایک عورت ایک ٹٹر کے پاس بیٹھی دوا پیس رہی تھی۔ برابر ایک بچی بیٹھی رو رہی تھی۔ ایک مریض زور زور سے کراہ رہا تھا اور پانی پانی چیخ رہا تھا۔ ایک بڈھا اس کے حلق میں عرق ٹپکا رہا تھا۔ کچھ مریض پڑے بھی تھے۔ حکیم صاحب ایک ٹٹر کے پاس جا کر ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پردہ ہو گیا۔ حکیم صاحب اندر گئے۔ دس گیارہ برس کی ایک لڑکی تعویذوں کا ہار پہنے بستر پر پڑی تھی۔ اس کی پٹی کے پاس پلنگ کے پایہ سے ایک بکرا بندھا تھا۔ لڑکی بخار کی تیزی میں واہی تباہی بک رہی تھی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی حال سنا اور عمل تجویز کیا۔ نسخہ لکھنے کو قلم دوات مانگی۔ مریضہ کا بھائی دوڑ کر اٹھا لایا۔ حکیم صاحب نے نسخہ پر ہُوالشافی لکھا۔ آگے لکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ صدائے اللہ اکبر کان میں آئی۔ حکیم صاحب نے قلم رکھ دیا اور مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔

شاہ ولایت حسین صاحب نے جو مغرب و عشا کی امامت کرتے تھے۔ اس وقت بھی امامت کی۔ نماز کے بعد حکیم صاحب نے سنتیں اور نفلیں پڑھیں۔ پھر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ جب دو ایک خاص خاص مریدوں کے علاوہ سب رخصت ہو گئے تو شاہ صاحب نے ان کو مراقبہ کرایا۔

عبادت سے فارغ ہو کر حکیم صاحب شاہ صاحب سے کہنے لگے

"حضرت! آج کل مراقبہ کی طرف میرا دل رجوع نہیں ہوتا۔ نماز میں بھی مریضوں کی طرف دھیان رہتا ہے۔ حالت ایسی ہے کہ اگر ذرا غفلت کروں تو ایک نہ ایک کی جان چلی جائے۔"

شاہ صاحب۔ دل لگے تو کیسے لگے۔ کاملین اسی وجہ سے دنیا سے پرہیز کرتے تھے

ہدایت کرتے ہیں۔ دنیا سرائے ہے۔ پل ہے۔ یہاں کے "اعمال" سے دل لگانا بے سود ہے۔ یہ تمہارا خیال بالکل غلط ہے کہ تمہاری بے توجہی سے کوئی مر جائیگا۔ یا تمہاری توجہ سے کوئی بچ جائیگا۔ موت و زندگی سوائے اس کے اور کسی کے اختیار میں نہیں۔ اگر اسکی مرضی یہی ہے کہ سب کو مار ڈالے تو اس میں کسی کا کیا اجارہ؟"

پھر ذرا ٹھہر کر کہنے لگے:۔

"تم نے جہانبانِ جہاں گشت کا قصّہ نہیں سنا کہ وُہ ایک مرتبہ اپنے شہر سے گزرے دیکھی تو زمین و دیندار لوگوں سے آباد تھا۔ سب رہنے والے خوش اخلاق۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ حضرت ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد پھر ادھر سے گزرے تو دیکھا کہ تمام شہر ویران پڑا ہے۔ مکان کے نشان تک نظر نہیں آتے۔ دیکھ کر ان کو بہت تاسف ہوا۔ خدمتِ باری میں عرض کیا "اے میرے مالک تجھے اتنے اچھے بندے تباہ کر کے کچھ افسوس نہ ہوا۔ ارشاد ہوا کہ زمین پر لکیریں بناؤ۔ اُنہوں نے بنائیں۔ پھر ارشاد ہوا کہ ان کو مٹا ڈالو۔ انہوں نے مٹا ڈالیں۔ جناب باری سے سوال ہوا تم کو ان لکیروں کے مٹانے کا کچھ افسوس تو نہیں ہوا۔ اُنہوں نے عرض کیا ان لکیروں کے مٹانے کا کیا افسوس ہو سکتا ہے۔ جب چاہوں بنا لوں۔ جناب باری سے ندا آئی۔ اسی طرح مجھے بھی اپنے بندوں کے مٹانے کا کچھ افسوس نہیں ہوتا۔"

"تو مقصد یہ ہے کہ یہ اسی کے کارخانے ہیں۔ وہی خوب جانتا ہے۔ ہمارے لئے تو یہ ہے کہ اسی میں خوش ہوں جو مرضئ الٰہی ہو۔"

پھر ایک لمبی سانس بھر کر بولے:۔

"ترکِ دنیا گیر تا سلطاں شوی!"

شاہ صاحب ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہوگئے۔ انہوں نے یہ تقریر آہستہ آہستہ دلنشین لہجے میں فرمائی تھی۔ حکیم صاحب اس کو سن رہے تھے اور ایک ہاتھ سے چٹائی کا تنکا توڑتے جاتے تھے۔ جب تقریر ختم ہوئی تو اس پر غور کرنے لگے مگر ذہن فوراً ہی بہک گیا اور یہ دیکھنے لگے کہ شاہ صاحب کے ڈنڈے کی شام پر ایک سبز رنگ لگا ہوا ہے۔ اس پر ایک سیاہ دھبہ معلوم ہوتا ہے۔ دھبہ کیسے لگا؟ کوئی چیز بھر گئی ہوگی کیا چیز ہو سکتی ہے؟ دیکھتے رہے، دیکھتے رہے، پھر خیال آیا، لاؤ اس کو صاف کر ڈالوں مگر اکبارگی کھڑے ہوگئے اور تیزی سے مسجد سے نکل کر مطب میں آئے۔ مریضہ کے عمل کا نسخہ لکھا اور پھر سلطان کے ساتھ چلنے لگے۔ مریضہ کا بھائی سمجھتا تھا کہ حکیم صاحب حسب دستور اپنے سامنے عمل دلائیں گے مگر جب ان کو جاتے دیکھا تو نسخہ کی ترکیب پوچھی۔ حکیم صاحب نے سرسری طور پر بتا کر پیچھا چھڑایا اور سلطان کے ساتھ چلے۔ سلطان کی بہن زہرہ کو بچپن میں نمونیا ہوگیا تھا اور حکیم صاحب کے علاج سے اچھی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ حکیم صاحب سے بہت ہل گئی تھی۔ ان کو چچا چچا کہتی تھی۔ اکثر چیزیں پکا پکا کر ان کو بھیجا کرتی۔ ان کے رومال اور تکیہ کے غلاف کاڑھ دیتی تھی۔ حکیم صاحب نے گھر جاکر زہرہ کو دیکھا۔ بخار بہت تیز تھا۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا

حکیم صاحب "زہرہ۔ زہرہ بی"

سلطان "بجیا! حکیم صاحب پکار رہے ہیں"

زہرہ کی ماں (پردہ کے اندر سے) حکیم صاحب! اس کو غفلت سی ہے۔ اور چونک پڑتی ہے"

حکیم صاحب "آپ گھبرائیے نہیں مرض کا معمولی حملہ ہے۔ جلد ہی اچھی ہو جائیگی"

حکیم صاحب نے نسخہ لکھا، ضروری ہدایات دیں اور سلطان سے کہا کہ گھر آکر دوا لیجانا

اور پھر پان کھا کر کہنے لگے۔

"معاف کیجئے گا، ٹھہر نہیں سکتا ہوں۔ سلطان سے پوچھئے مریضوں کی کتنی کثرت ہے کھانا کھانے تک کی مہلت نہیں ملتی۔"

"آپ لوگوں کی محنت خدا قبول کرے۔ ایک ہفتہ ادھر سنا تھا کہ بیماری کا زور کم ہو گیا ہے۔"

حکیم صاحب: "ہاں ادھر زور ضرور کم ہو گیا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ خدا نے اپنا فضل کیا اور یہ بلا دور ہوئی مگر پھر اکدم سے زور بڑھ گیا۔ عجب پریشانی ہے۔ گھر کی ماما بھاگ گئی وحیدہ کی ماں ایک طرف تو گھر بھر کا کھانا پکاتی ہیں۔ دوسری طرف کبھی چار کبھی چھ مریضوں کے لئے بھی کھانا تیار کرنا پڑتا ہے — وحیدہ سے بھی جو بن پڑتا ہے کرتی ہے مگر اس بچاری کو اپنے بچے سے چھٹی نہیں ملتی۔

"ادھر وحیدہ کی ماں کو ان کے بھائی بہت بلا رہے ہیں۔ وہ اس پر راضی نہیں ہوتیں کہ بچوں کو لیکر بلا میرے چلی جائیں۔ خدا اپنا فضل کرے۔ اب تو پورا قصبہ ویران ہو گیا۔ بازار دیکھ کر آنسو بھر آتے ہیں۔"

زہرہ کی ماں: "حکیم صاحب! کچھ مریض اچھے بھی ہوئے ہیں۔ آپ کو سلیمہ کی قسم بتلایئے، میری زہرہ اچھی ہو جائے گی؟"

حکیم صاحب: "آپ پریشان نہ ہوں۔ مرض کا ہلکا اثر ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی اچھی ہو جائے گی۔"

وہاں سے حکیم صاحب بھاگے ہوئے آئے۔ پہلے، حلقے کا ایک چکر لگایا، شفاخانے مریضوں کو ہدایات دیں اور پھر گھر آئے۔ بیوی نے کھانے کو پوچھا تو بولے:-

"نماز سے آکر۔"

بیوی نے لوٹا دیا۔ انہوں نے وضو کیا۔ پھر مسجد گئے۔ وہاں سے آکر ایک نئے مریض کو دیکھا۔ تقریباً گیارہ بجے کھانا کھا کر لیٹے۔ تھکے بہت تھے فوراً سو گئے۔ دو بجے چھدو نے آکر آواز دی کہ نیا مریض آیا ہے۔ حکیم صاحب کا حکم تھا کہ اگر کوئی نیا مریض آئے یا کسی کی حالت نازک ہو تو فوراً جگا دو۔ بیوی نے چھدو کی آواز سنی مگر خاموش رہیں۔ چھدو نے ایک آواز اور دی۔

حکیم صاحب کی بیوی بڑبڑانے لگیں۔

"دن کو کھانا نصیب نہ ہو، رات کو سونے سے بھی گئے ان موئے مریضوں کو اپنی جان کی پڑی رہتی ہے اور حکیم کی جان کی پروا نہیں۔"

بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے حکیم صاحب کو جگایا۔ انہوں نے جیسے نئے مریض کا نام سنا مستعدی سے اٹھے اور باہر چلے گئے۔

(۱۴)

طاعون کا اتنا زور تھا مگر حکیم صاحب کا گھرانہ ابھی تک محفوظ تھا۔ لیکن فلک کو یہ نہ بھایا اور ایک دن حکیم صاحب کی ماں کو بخار آیا جو دم بدم تیز ہوتا گیا۔ دوسرے دن بغل میں گلٹی دکھائی دی۔ حکیم صاحب سے جو بن پڑا کیا مگر موت سے کب رستگاری ہے۔ پھر ضعیفی میں معمولی مرض بھی مرض الموت ہو جاتا ہے۔ بچاری تیسرے دن دنیا سے سدھار گئیں۔

حکیم صاحب کے دل پر جو گذرا ہو گذرا ہو مگر ان کی زبان سے کسی نے سوائے انا للہ وانا الیہ راجعون کے ایک کلمہ بھی نہیں سنا۔ وہ ایک دن تک ذرا چپ چپ حزیدہ رہے

لیکن مریضوں کی خدمت یا نماز کی پابندی میں ذرا فرق نہ آیا۔

اس کے چوتھے روز حکیم صاحب ایک مریض کو جواب سنبھل گیا تھا، کچھ ہدایات دے کر احاطے سے رخصت کر رہے تھے کہ چھدو بھاگتا ہوا آیا۔

چھدو:۔ بی بی نے کہا ہے کہ بٹیا کے سر میں درد ہو رہا ہے اور بخار بھی معلوم ہوتا ہے آکر فوراً دیکھ لیجئے۔"

حکیم صاحب بے تحاشا زنانے کی طرف بھاگے۔ ہاتھ میں مریض کا نسخہ تھا۔ وہ بھی دینا بھول گئے۔ سلیمہ ماں کی گود میں لیٹی رو رہی تھی۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو بھرے سر دبا رہی تھی۔ حکیم صاحب نے پکارا

"سلیمہ، سلیما"

سلیمہ:۔ ابا درد کے مارے سر پھٹا جاتا ہے"

حکیم صاحب:۔ تو روتی کیوں ہے، ابھی درد کم ہوا جاتا ہے"

پھر بیوی سے بولے:۔

"ذرا پانی گنگنا کر دو اس کو ایک خوراک دوا دے دوں"

بیوی نے منہ پھیر کر دوپٹے سے آنسو پونچھے اور چپکے سے اٹھیں۔ حکیم صاحب پاس بیٹھ گئے۔ تھرمامیٹر لگا کر بخار دیکھا تو ۱۰۵۔ لڑکی پھنکی جاتی تھی۔ بلبلا بلبلا کر باپ کے گلے میں باہیں ڈال دیتی۔ حکیم صاحب اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے سر دباتے اور بہلاتے جاتے۔ جب پانی گرم ہو کر آگیا تو حکیم صاحب نے دوا بنا کر بیوی کو دی اور کہنے لگے۔

"درد اور بخار کم ہو جائے گا، میں ابھی آتا ہوں"

بیوی:۔ لڑکی کی حالت چھوڑنے کے قابل نہیں"

حکیم صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا۔ باہر آئے یہاں ایک نیا مریض آیا تھا۔ اس کو دیکھا جلدی سے نسخہ لکھا اور پھر اندر جانا چاہا۔ مریض کا باپ اپنے لڑکے کو اس ارادے سے لایا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے یہاں ٹھہر جاؤں گا۔ مگر انہوں نے پوچھا نہیں تو خود بولا۔

"حضور میں ٹھہر جاؤں"

حکیم صاحب نے روکھے پن سے جواب دیا:۔

"حاطے میں جا کر دیکھو۔ اگر جگہ ہو تو ٹھہر جاؤ"

جس مریض کا نسخہ حکیم صاحب لئے چلے گئے تھے بولا:۔

"حضور پھر ہم جائیں"

حکیم صاحب "اور کیا کرو گے"

مریض "اور وہ نسخہ حضور نہیں دیں گے"

حکیم صاحب "کون نسخہ"

مریض "جو آپ نے لکھا تھا۔ شاید اندر لئے چلے گئے"

حکیم صاحب نے جواب نہیں دیا اور اندر چلے گئے۔ لوگ متحیر تھے کہ یا تو حکیم صاحب اتنی مہربانی سے پیش آتے تھے یا یہ تغیر۔

"حکیم صاحب کچھ ناراض ہیں"

"بچارے گھبرائے ہوئے ہیں۔ ان کی لڑکی کو بخار آگیا"

"کون لڑکی"

"چھوٹی"

"ارے توبہ۔ کتنی پیاری بچی ہے۔ میرے مالک اچھا رکھنا"

"بچارے حکیم صاحب نے ہم لوگوں کی خاطر دن کو دن، اور رات کو رات نہ سمجھا کوئی اور ہوتا تو قصبہ چھوڑ کر بھاگ گیا ہوتا۔ گھر میں کیا روپیہ کی کمی ہے مگر کیا دل ہے۔ آدمی نہیں فرشتہ ہیں فرشتہ۔"

"ان کے باپ کا بھی یہی حال تھا۔ پچھلی مرتبہ ہیضہ کی فصل میں انہوں نے اتنی بلکہ اس سے زائد قصبہ کی خدمت کی۔ اسی میں تو انتقال کیا۔"

اتنے میں چھیدو نسخہ لئے آیا اور مریض کو دیا

"بٹیا کیسی ہیں؟"

"بخار دم بدم تیز ہوتا جاتا ہے۔ سرسامی کیفیت ہے۔ سر کے بال کٹوا دیئے گئے ہیں ماں کا تو عجب حال ہے۔ بچے بڑھے سب ہی پریشان ہیں۔ لڑکی تو گھر بھر کا کھلونا ہے۔"

دو گھنٹے کے بعد حکیم صاحب گھر سے نکلے جو مریض موجود تھے۔ ان کو سرسری طور پر دیکھا کسی کو بھی اپنے سامنے دوا نہیں دی۔ سلطان آیا تھا۔ وہ کہنے لگا

"بجیا کا بخار اتر گیا ہے۔ آپ کو بہت بلا رہی ہیں۔ کہا ہے، کھڑے کھڑے آجایئے۔"

حکیم صاحب: "بٹیا سلیمہ کو تیز بخار ہے، حالت اچھی نہیں۔ ورنہ میں ضرور چلتا نسخہ لیتے جاؤ۔"

نماز میں حکیم صاحب نے پیر صاحب سے حال بیان کیا۔ انہوں نے ہمدردی ظاہر کی۔ اس دن مراقبہ نہیں کیا گیا اور پیر صاحب حکیم صاحب کے ساتھ گھر آئے۔ مریضہ پر پھونک ڈالی کچھ ماں کو سمجھاتے رہے۔ پھر ایک تعویذ لکھ کر سلیمہ کے گلے میں ڈال دیا اور بولے:-

"لڑکی اچھی ہو جائے گی۔"

پیر صاحب کے ہمراہ حکیم صاحب باہر آئے۔ یہاں مریضوں کا مجمع لگا تھا۔ مگر کسی نے کچھ جواب

کو پکارا نہیں تھا۔

رام لال جس کی بہن حکیم صاحب کے حاطے میں بیمار پڑی تھی۔ قریب آکر بولا:۔

"حکیم جی۔ بہن کی حالت بہت خراب ہے۔"

حکیم صاحب خاموش اس کے ساتھ ہو لئے۔ یہاں آکر دیکھا تو سانس اُکھڑ چکی تھی کہنے لگے۔

"اب کوئی امید نہیں۔"

مریضوں کو سرسری دیکھ رہے تھے کہ ان کے ایک دوست اکبر آگئے اور بولے کہ۔

"لڑکے کی حالت بہت خراب ہے۔"

ان سے تعلقات ایسے تھے کہ انکار بن نہیں پڑا اور ساتھ چلے گئے۔ وہاں کافی دیر لگی جب واپس آئے تو معلوم ہوا کہ سلیمہ کے گلٹیاں ظاہر ہو گئیں۔

حکیم صاحب نے ٹھنڈی سانس بھر کر لیپ تیار کرنے کا حکم دیا۔

دوسرے دن حالت بگڑ گئی۔ حکیم صاحب نے اپنا علاج کارگر نہ ہوتے دیکھ کر لکھنؤ سے ایک مشہور ڈاکٹر بلایا۔ اس نے آتے ہی گلٹی کا آپریشن کیا۔ دو ایک انجکشن دئے مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا اور دوسرے دن سانس اکھڑ گئی۔

حکیم صاحب کو دو گھنٹہ سے اندر جانے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ چھدو روتا ہوا آیا اور کہنے لگا:۔

"بٹیا کی حالت بگڑ رہی ہے۔"

حکیم صاحب لپکے ہوئے اندر گئے تو دیکھا ماں پٹی سے لگی بیٹھی ہے سسکیوں کی آواز

آرہی ہے۔ سلیمہ کی گردن تکیہ پر ڈھلک گئی ہے۔ دو دو منٹ کے بعد ایک تشنجی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ سانس کھینچتے وقت گردن میں سخت جھٹکا لگتا ہے۔

حکیم صاحب نے آواز دی مگر جواب نہ دینے کا سلیمہ کو ہوش کب تھا؟ اُنہوں نے شاہ ولایت حسین صاحب کے بلانے کو آدمی بھیجا۔ وہ خبر سنتے ہی فوراً آئے۔ ماں کو صبر کی تلقین کی اور سرہانے بیٹھ کر یٰسین پڑھنے لگے۔

اس وقت حکیم صاحب کو کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ یہ بھی بھول گئے تھے کہ باہر مریضوں کو منتظر چھوڑ آئے ہیں۔ اسی طرح گردن جھکائے دیر تک بیٹھے رہے۔ سلیمہ کو سکرات کی تکلیفوں میں دیکھ کر ان کے آنسو نہ تھم سکے اور دو ایک بڑے بڑے قطرے پلکوں سے ڈھلک کر گالوں پر ہوتے ہوئے ڈاڑھی پر آگرے۔ غم کی شدت میں ان کو پونچھنا بھی بھول گئے۔ حکیم صاحب دنیا میں سب سے زیادہ سلیمہ کو چاہتے تھے۔ صرف یہی ایسی ذات تھی جس کی خاطر وظیفہ کے دوران میں اکثر بول دیتے تھے۔

اسی حالت میں تھے کہ "اللہ اکبر" کی آواز کان میں آئی جس طرح مردے صور کی آواز سے چونک پڑیں گے۔ حکیم صاحب اور شاہ صاحب دونوں چونک پڑے اور بسم اللہ کہہ کر اُٹھے حکیم صاحب کے گھر میں بچے بوڑھے سب نماز کے بہت پابند تھے مگر اس وقت غم نے سب کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ کسی کے دل میں اتنی تاب نہ تھی کہ نماز کو جاتا مگر آگے آگے شاہ صاحب اور پیچھے پیچھے حکیم صاحب مسجد کی طرف چلے۔ جس طرح بجھتا چراغ بھڑک اُٹھتا ہے۔ اسی طرح سلیمہ کو بھی آخری سانس کے ساتھ ہوش آگیا اور اس کی زبان سے نکلا

"ابا!!!"

حکیم صاحب نے پلٹ کر دیکھا۔ سلیمہ کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ ہونٹوں کو کچھ

حرکت ہوئی اور لوگوں کو ایسا گمان ہوا کہ واپس آ جائیں گے مگر منہ کے الفاظ منہ ہی میں رہ گئے اور وہ "یا الرحم الراحمین" کہہ کر گردن جھکائے چلے گئے۔

ادھر وہ باہر نکلے ادھر لڑکی کی سانس بند ہو گئی۔ بچاری ماں نے ہائے کہہ کر پٹی پر سر دے مارا۔ اس وقت حکیم صاحب نیت باندھے نماز میں کھڑے تھے : معلوم دل کی کیا حالت تھی مگر بظاہر خشوع و خضوع میں کچھ فرق نہیں تھا۔

(۴)

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ بیماری کی وہی حالت تھی اور حکیم صاحب کی مصروفیت بدستور۔ بیگم صاحب کی بیوی کے پاس ان کے بھائی کے خط پر خط آ رہے تھے کہ تمام مع حکیم صاحب اور بچوں کے یہاں چلی آؤ مگر ان سے یہ تو نہ ہو سکا کہ حکیم صاحب کو چھوڑ کر چلی جائیں اور حکیم صاحب سے چلنے کے لئے کہنا ہی بیہودہ تھا۔ مجبوراً انہوں نے لڑکوں کو گوالیار بھیج دیا اور خود مع حکیم صاحب کی ایک بیوہ بھاوج کے گھر میں تنہا رہ گئیں۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ حکیم صاحب نے بیوی سے کہا

"ذرا پانی رکھ دینا۔ اگر موقع ملا تو بدن پر ڈال لوں گا۔"

گیارہ بج رہے تھے۔ حکیم صاحب مطب میں تھے کہ ایک نیا مریض آیا۔ سولہ سترہ برس کا لڑکا تھا۔ بڑا ساقد، خوبصورت جسم، بڑی بڑی آنکھیں جو بخار کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ گال تمتمائے ہوئے تھے رما تھے پر چھوٹا سا منت کا سیندور کا ٹیکا تھا۔ اکثر ابا ابا چلاتا اور اٹھ بیٹھتا۔ بدن پر ایک چھوٹی سی لال لوئی پڑی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا بڈھا باپ تھا اور چھوٹی سی بیوی تھی جس کا سن مشکل سے بارہ تیرہ برس کا ہوگا مگر پھر بھی گود میں ایک لڑکا تھا۔ بیوی لٹکے کو چھاتی سے لگائے گھونگھٹ نکالے سسکیاں لے رہی تھی۔ باپ بھی غم سے بدحواس تھا۔ اس کا یہی

ایک لڑکا تھا جس کی دو سال ہوئے شادی کی تھی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی۔ حالت نازک تھی، بچنے کی امید کم تھی، مگر تھی۔ جب لڑکے کے حواس درست ہوتے تو گھبرا گھبرا کر بیوی اور بچے کی طرف دیکھتا اور پھر بڈھے باپ کی طرف۔ اس کی بیکسی سے بھری آنکھیں، مستقبل کے خطرات سے سہمی ہوئی نظریں اور ان میں ایسا درد پنہاں تھا جس نے حکیم صاحب کی ہمدردی کو جذب کر لیا۔

حکیم صاحب نے اپنے ہاتھ سے دوا دینا شروع کی۔ سلیمہ کی موت کے بعد سے انہوں نے پہلی مرتبہ ایک مریض کا اتنا خیال کیا تھا۔

ایک گھنٹے کے اندر مریض کو دو مرتبہ قے ہوئی۔ قے ہونے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے بخار کا زور کم ہو جاتا۔ مگر پھر فوراً تیز ہو جاتا۔ مریض باپ اور بیوی کی پریشانی کے خیال سے ہوشیار رہنے کی کوشش کرتا مگر بیسود، اس کی بیماری کی غفلت سے جنگ اور پھر ناکامی باپ اور بیوی کو اور زیادہ بدحواس کئے دیتی تھیں۔ اس نے کئی بار حکیم صاحب سے کچھ کہا مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بدن میں پھریری پیدا ہوئی۔ حکیم صاحب نے دوا دی جس سے فوراً قے ہوئی۔ حکیم صاحب ایسے موقعوں پر اپنی احتیاط بہت کرتے تھے اور عموماً قے کے وقت دور ہٹ جایا کرتے تھے مگر اس مرتبہ انہوں نے خلاف معمول لڑکے کو تھام لیا۔

چھدو جو قریب کھڑا تھا فوراً دوڑ پڑا اور حکیم صاحب کو تو دھکا دے کر الگ کیا اور خود لڑکے کو تھامنے لگا۔ باپ نے اس کا ہاتھ بٹا لیا۔

اذان ہو چکی تھی۔ نماز کا وقت قریب آ گیا تھا۔ چھدو نے وضو کیلئے پانی لا کر رکھ دیا تھا مگر حکیم صاحب مریض ہی کی طرف متوجہ تھے۔ قے کے بعد لڑکے کو کوئی دوا دی گئی تھی مگر پانچ ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ اس کو پھر ابکائی آئی۔ حکیم صاحب بے تحاشا کھڑے ہو گئے اور چھدو کو دوا تیار کرنے بھیجا۔ خود ٹہلنے لگے۔ لڑکے کے منہ سے تھوڑا سا زرد زرد پانی گرا۔ پھر اپنی اوپنی سانسیں لیتا ہوا

لیٹ گیا۔

حکیم صاحب بہت بےچینی سے ٹہلتے رہے۔ چھدو کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد آواز دیتے تھے۔ نماز کا وقت گزرا جا رہا تھا۔ بڈھے باپ اور کمسن بیوی کی آنکھیں حکیم صاحب کی نقل و حرکت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ آخر حکیم صاحب ذرا تیز ہو کر مسجد کی طرف چلے۔ سب کو یقین ہو گیا کہ نماز کو گئے اور ڈیڑھ گھنٹہ سے پہلے واپس نہیں ہوں گے۔ حکیم صاحب کے راستہ میں ایک پیپل کا درخت لگا تھا جس پر ریشوں کے بھیگے کپڑے سوکھنے کو پھیلے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب کی رفتار سست ہو گئی اور درخت کے پاس آ کر بالکل معمولی ہو گئی۔ وہ کپڑوں کی طرف دیکھنے لگے اور درخت کے گرد چکر لگا کر واپس آ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو درخت پر کسی چیز کو تلاش کرنے گئے تھے یا ٹہلتے ٹہلتے وہاں تک بڑھ گئے تھے۔ واپس آ کر مریض کی نبض دیکھی اتنے میں چھدو دوا لئے ہوئے آیا۔

وہ حکیم صاحب کو بالکل خلاف امید موجود پا کر حیرت زدہ ہو گیا اور بولا۔

"حکیم صاحب! ابھی عمل دے لوں گا۔ نماز کا وقت جا رہا ہے۔"

حکیم صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا چھدو کے ہاتھ سے دوا لیکر اس لڑکے کو پلائی۔ اپنے سامنے عمل دلایا۔ دو گھنٹہ کے بعد جب اس کی حالت سنبھلتی معلوم ہوئی تو اپنے ساتھ لیکر احاطے میں اس کے ٹھہرنے کا انتظام کرنے چلے گئے۔ حکیم صاحب کا نماز کو قضا کر دینا اتنا حیرت انگیز واقعہ ہوا کہ سننے والے کو یقین نہیں آتا تھا۔ مولانا ولایت حسین تو یہ خبر سنکر سناٹے میں آ گئے۔

بھرے بازار میں

کوئی چیز رکھی کے پیٹ پر بھد سے گری۔ رکھی کنمنائی اور آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگی پھر ایک زیادہ وزنی چیز آکر چھاتی پر گری اور ساتھ ہی ایک قہقہہ سنائی دیا۔ اب رکھی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے گلی کے نکڑ پر کلّو کو دیکھا جس نے رکھی سے آنکھیں ملاتے ہی ایک فحش فقرہ چپکایا اور سڑک کی بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

رکھی نے اپنی چھاتی پر سے "چیز" اٹھائی۔ یہ چار کیلوں کا ایک گچھا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی رکھی کھل گئی اور بیتابی سے ایک کیلا چھیل کر منہ میں رکھ لیا اور وہ تین بار اِدھر اُدھر منہ مار کر نگل گئی۔ پھر دوسرا کیلا چھیلا، اور آدھا دانت سے کاٹ کر ذرا مزے لے کر کھانے لگی تو نہ جانے کچھ خیال آیا۔ جلدی سے رکھی نے اسی طرح لیٹے لیٹے اِدھر اُدھر ٹٹولا تو ایک نارنگی ہاتھ لگی۔ اس کو دیکھتے ہی اس کی دل کی کلی کھل گئی۔ دس بارہ روز بیمار رہنے کے بعد ایسا خراب منہ کا مزہ ہو جاتا ہے! ایسے موقعہ پر نارنگی کا مل جانا! رکھی سوچنے لگی اگر یہ کھٹی کھٹی نارنگی نمک مرچ

کے ساتھ کھائی جاتی تو؟ مگر نمک مرچ اس وقت کہاں؟ مجبوراً رکھی نمک مرچ کو یاد کر کے ایک ایک پھانک منہ میں رکھنے لگی اور اس کو خوب چٹخارے لیکر کھانے لگی۔

گھڑگھڑ کرتی سامنے سے ٹرک پر ٹرام نکلی۔ اس میں ایک صاف ستھری لڑکی، بیاہ کنارے کی اجلی ساڑی باندھے بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہ ادھر پڑ گئی تو اس نے دیکھا کہ بغل کی پتلی سی گلی میں کچھ دور پر ایک دوکان کے آگے ایک تختہ سا نکلا ہوا ہے جو زمین سے بمشکل دو فٹ اونچا ہوگا۔ اس کے نیچے ایک میلی گندی، اندرد عورت بڑے آرام سے لیٹی نارنگی کی پھانکیں کھا رہی ہے۔ چہرے پر ایسا اطمینان ہے گویا وہ آبادی کے کنارے کسی پرسکون مکان کے ڈرائنگ روم میں صوفہ پر اطمینان سے لیٹی ہو۔ لڑکی جب تک رکھی کو دیکھ سکی دیکھتی رہی۔ رکھی نے بھی اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ اس کی ساری اور صاف ستھری گردن کو ذرا غور سے دیکھا اور پھر بلا ارادہ اپنی گردن مل مل کر میل کی بتیاں چھڑانے لگی۔

رکھی اٹھ کر بیٹھ گئی اور انگڑائی کے لئے دونوں ہاتھ اوپر اٹھانا چاہے مگر اوپر اتنی جگہ ہی نہ تھی۔ رکھی نے ذرا بےچین ہوکر بدن کو ایک بل دیا اور جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ داہنی طرف پھینک دئے۔ پھر پیٹھ میں ایک بل دے کر انگڑائی لی۔ مگر فوراً ہی ایک سسکی بھر کر سیدھی ہو گئی اور گھبرا کر پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ دیکھتی کیا ہے کہ اس کے سر کے کچھ بال چیچک کے سوکھے دانوں میں چپک گئے ہیں۔ پھر اس نے سر پہ ہاتھ پھیرا تو سر کو چکٹا ہوا پایا۔

میل تھا کہ بدن کو کھائے جا رہا تھا۔ رکھی کچھ ایسی گھبرائی کہ بلبلا کر اپنے بل سے باہر نکل آئی کھڑی ہوئی تھی کہ چکر آگیا۔ اس نے جلدی سے دوکان کے پٹرے پکڑ لئے، پھر ذرا سنبھل کر پاس والے نل سے پانی پیا اور سوچنے لگی کہ کہاں چل کر نہانا چاہیے۔

جب تندرست تھی تو صاف ساری لیکر دریا پر جاتی، وہاں میلی ساری دھوتی تھی، پھر

جی بھر کر نہاتی تھی

ادھر بارہ روز تک بیمار رہی۔ اتنے دنوں تک میلی گندی پڑی رہی۔ پہلے بچہ ہوا، اس کا بندوبست کیا ہی تھا کہ چیچک نکلی۔ اس میں آٹھ روز تک پڑی رہی۔ بیماری ایسی تھی کہ کسی کو بتا نہیں سکتی تھی جو کوئی پوچھتا اس سے کہہ دیتی کہ بخار ہے، کو نین کھا رہی ہوں۔ غنیمت ہوا کہ چیچک نے چہرے اور ہاتھوں پر قبضہ نہیں جمایا۔ ورنہ جہاں پڑی تھی۔ وہاں سے الگ نکالی جاتی اور جو یار آشنا تھے۔ وہ الگ ساتھ چھوڑ دیتے۔

بارہ روز بیمار رہی، اچھے لوگ ایسی بُری عورت کے قریب کیا پھٹکتے، بُرے لوگوں نے اس کی خبر لی۔ پورن نے دوکان کے نیچے پڑے رہنے دیا۔ مہابیر کلو نے دودھ لا کر اور کھانے پینے کی خبر لی۔ خیر، بُرے دن کٹ گئے۔ دو چار روز میں پھر گالوں پر رونق آجائیگی اور پھر وہی پارک کی تفریحیں ہوں گی اور نگاہوں کو رجھانا۔

کہاں چل کر نہانا چاہیئے؟ دریا اتنی دور ہے کہ اس کا خیال ہی فضول ہے۔ مہابیر اور کلو مزدوری پر گئے ہوں گے اور ان کے گھروں میں تالے پڑے ہوں گے۔ وہ لوگ ہوتے بھی تو ان کے یہاں نہانے کی جگہ کہاں؟ وہ آپ نل پر نہاتے ہیں۔ چلو نل گھٹ چلیں۔

کارپوریشن کی طرف سے ایک بڑا سا غسلخانہ بنا تھا۔ رکھی اس کو نل گھٹ کہا کرتی تھی اور کبھی کبھی جب دیر ہو جاتی تو دریا کے بجائے نہانے دھونے وہیں چلی جاتی تھی۔ اس وقت اسی طرف چلی۔ راستہ میں یہ سوچتی جاتی تھی کہ نہا کر پہنوں گی کیا ایک ساری پہنے ہوئے ہوں اور اس کے جوڑ کی جو ساری تھی۔ وہ بچے کے ساتھ گئی۔

رکھی ڈگمگا ڈگمگا چل رہی تھی۔ اگر نہانے کی تمنا اس کے سر پر ایسی مسلط نہ ہوتی تو شاید اس کو اٹھتے بھی بُرا لگتا۔ لیکن اس وقت تو یہ خیال دل میں گُھسا ہوا تھا کہ اگر میں نہا ڈالوں تو

میل، بیماری، کمزوری اور بدن کی بے رونقی سب کچھ دور ہو جائے اور آج ہی پارک کے قابل ہو جاؤں۔ اس خیال نے اس کو ایسی ہمت دے دی تھی کہ پاؤں کانپ رہے تھے مگر وہ آگے بڑھی چلی جاتی تھی۔ تھوڑی دور چلی تھی کہ بدن پر ایک دم سے چیونٹیاں سی رینگتی معلوم ہوئیں۔ یہ کھجلی ـــــــ وہ کھجلی۔ سارے بدن میں کھجلی ہی کھجلی۔ توبہ۔ یہ سب میل ہے اور کچھ بھی نہیں اگر جلدی میل نہ دور ہو گیا تو مورچے کی طرح میرے بدن کی رنگت ورو ہت کھا جائیگا۔

رکھی کا 'نل گھٹ' سامنے آگیا۔ کچھ لوگ کپڑے دھو رہے تھے۔ پانی کی بوندیں، دیوار کے اوپر اڑ کر دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ موتی کی ایسی بوندیں! یہ سب میل صاف کر دینگی کہیں سے صابن بھی مل جاتا!

رکھی اندر گھسی۔ ایک موٹی سی عورت اکڑوں بیٹھی آگے کی طرف جھکی کپڑے زمین پر پٹک رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی پاس بیٹھی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے صابن کا پھین اکٹھا کر کے ٹیلا بنا رہی تھی۔ مگر ادھر یہ ٹیلا بنا کر اونچا کرتی .... اور ادھر پانی کی دو ایک بوندیں گر کر اس کی ساری محنت اکارت کر دیتیں۔ یہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔ دوسرے کونے میں دو عورتیں بدن مل رہی تھیں۔ ایک طرف ایک لڑکی نہا کر صاف کپڑے پہن رہی تھی۔ رکھی نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ سب نے فوراً اس کی طرف دیکھا اور سب نے بہت برا منہ بنایا۔ رکھی کی ہمت ان کی نگاہوں کو دیکھ کر کمزور پڑ گئی۔ یہ نفرت کیوں؟ کیا یہ جانتی ہیں کہ میں کون ہوں؟ کیسے جاننے لگیں؟ کوئی میرے ماتھے پر میرا پیشہ لکھا ہوا ہے؟"

رکھی (موٹی عورت سے) "بہن ذرا میں نہالوں"۔

موٹی عورت نے پلٹ کر اس کی طرف بڑی تیز نظروں سے دیکھا اور پھر ہاتھ جھٹک کر بولی :-

"بھاگ بھاگ، ملیچھ، اس کے پاس سے بو کیسی آ رہی ہے۔"

سب عورتیں اُدھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ ایک دم سے بول اُٹھیں

"رے تیرے پاس کیسی بو آ رہی ہے۔ الگ الگ۔"

"اُدھر سے جا۔"

"دریا پر جا۔ وہاں جا کر نہا۔"

"جاتی ہے کہ نکالوں۔"

"ہٹ یہاں سے ہٹ۔ اس کو دق ہے اس کی صورت تو دیکھو۔"

موٹی عورت: "بنا پٹیں کے نہیں جائیگی۔"

رکھی اُن کی چاؤں چاؤں سے گھبرا گئی۔ ایک کو جواب دینے لگتی کہ دوسری بھڑ جاتی آخر رکھی کو غصہ آ گیا۔ اُس کے جی میں آ رہا تھا کہ ان سب کا منہ نوچ لوں بال خوب نوچے لوں اور بن پڑے تو کاٹ کھاؤں! اتنے میں موٹی عورت اُٹھی اور اُس نے اپنی بچی کا بنایا ہوا صابن کے بیسن کا ٹیلا ہاتھ میں لے کر رکھی کے منہ پر کھینچ مارا۔ رکھی کی آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں۔ اُس نے گھبرا کر ساری کا پلو آنکھوں میں بھر لیا اور بڑی بے بسی سے چلانے لگی۔ دونوں عورتیں اور لڑکی قہقہہ مار کر ہنسیں۔

موٹی عورت گرج کر بولی

"بھاگتی ہے کہ اور کچھ لے گی۔"

رکھی اچھی ہوتی تو ایسی آسانی سے تو نہ بھاگتی۔ بلکہ موٹی عورت کو تو اس کے کئے کی سزا دے ہی دیتی مگر اب اسے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ گھبرائی ہوئی باہر نکل آئی۔ آنکھوں میں ایسی تکلیف تھی کہ میل کچیل بنانا دھونا سب بھول باہر بھاگ آئی

نل ول کر بڑی مشکلوں سے ایک آنکھ کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا تو دو سو گز کے فاصلہ پر ایک نل تھا۔ رکھی دوڑ کر ادھر گئی۔ پانی سے آنکھوں کو خوب دھویا جب ذرا آرام ملا تو کچھ سوچ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ایک دوکان پر ایک آدمی پنکھا منہ پر رکھے سو رہا تھا۔ اس کے پاس ایک نوجوان سفید کرتا پہنے ہوئے بیٹھا نیند بھری آنکھوں سے رکھی کو تک رہا تھا، کچھ دور ایک کپڑے والے کی دوکان پر ایک میاں صاحب دھوپ سے بچنے کو رومال مُنہ پر ڈالے کھڑے بھاؤ تاؤ کر رہے تھے۔ ان کے قریب رکھنا والے پسینے اور میل میں سنے کھڑے تھے۔ رکھی نے دوکان والے نوجوان کو ایک بار دیکھا اور کچھ ارادہ کر کے اپنی ساری سمیٹی۔ مگر پھر کچھ سوچ کر رُک گئی۔ ادھر اُدھر اک بار پھر دیکھ کر ذرا اطمینان کیا اور پھر ساری سمیٹی مگر پھر جھجکی۔ آخر جی کڑا کر کے ایک بار نل کے نیچے بیٹھ ہی گئی اور ایک ہاتھ سے کھٹکا دبایا۔ کمزوری کی وجہ سے کھٹکا اچھی طرح نہیں دبا مگر پھر بھی تھوڑا تھوڑا پانی اس کے سر اور پیٹھ پر گرنے لگا۔

نوجوان چلایا۔ "ہائیں ہائیں ——— ہائیں ہائیں"۔

نوجوان کا باپ (چونک کر چلایا) "بازار میں نہائے گی۔ اری او بیحیا کیا کرتی ہے" اس سڑک پر شریف دوکاندار تھے۔ سب بے تحاشا چلانے لگے "بدمستانی ہے" "بدمستانی ہے"۔ کپڑے کی دوکان کے میاں صاحب بھاؤ تاؤ چھوڑ چھاڑ ادھر دوڑ پڑے پاس آ کر انہوں نے رکھی کی اُنگلیوں پر چھڑی ماری۔ رکھی کے ہاتھ سے نل کا کھٹکا چھوٹ گیا۔ نل بند ہو گیا۔

اب اُنہوں نے رکھی کی پیٹھ میں چھڑی چبھوئی اور چلائے :۔

"چل ہٹ سڑک پر سے۔ بڑی آئی ہے نہانے"۔

نل کے گرد میلا لگ گیا۔

چھڑی کی نوک جیسے گڑی، رکھی نے تکلیف سے منہ کھول دیا، آنکھیں سکوڑلیں اور منہ سے ایک چھوٹی سی چیخ نکل گئی مگر پھر فوراً ہی دانت بھینچ کر دونوں ہاتھوں سے نل پکڑ لیا اور جم کر وہیں بیٹھ گئی۔

بڑے میاں "- ارے ہٹ ہٹ، ارے ہٹتی نہیں"۔

"کیا کرنا چاہتی ہے"۔

"کیا یہاں نہائے گی؟"

"کلکتہ میں کتنی بے حیائی ہے۔ رام رام"۔

"اور ساری تو دیکھو کیسی مہین ہے"۔

"شکل چڑیلوں کی مزاج پریوں کا۔ آتی ہیں نہانے"۔

بڑے میاں نے ہمت کر کے ایک بار زور سے چھڑی گڑھوئی اور پھر ہار کر ہاتھ ڈھیلا کر لیا۔ رکھی نے پھر نل کا کھٹکا دبایا۔ یہ دیکھ کر رکشا والے جو مجمع کو چیر کر اندر آ گئے تھے بولے :-

"کیا ہے کیا ---- نہا بھی لینے دیجئے"۔

"نہا لینے دیجئے بچاری کو"۔

"گرمی سخت ہے"۔

مجمع سے ایک نے آوازہ کسا۔

"چلو میرے گھر میں نہاؤ۔ ایسا غوطہ دوں . . . !"

ایک صاحب تہمد باندھے کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ایک بار جوش میں

آگے بڑھے۔ وہ سمجھنے والے سمجھے کہ دو چار ہاتھ تو اس بیچاری عورت پر جھاڑ ہی دیں گے کہ اتنے میں پولیس والا نہ معلوم کدھر سے اندر گھس آیا اور اس نے رکھی کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے میں اس کو اپنی جگہ سے اٹھا مجمع کے باہر کر دیا اور پھر فاتحانہ انداز میں بولا

"نہیں ہٹتی تھی —— ایک عورت کو نہیں بھگا سکتے!"

مجمع میں تالیاں سیٹیاں بجنے لگیں۔ قہقہے اڑے اور آوازے کسے گئے۔ رکھی ہارے جنرل کی طرح سر جھکائے پیٹھ سہلاتی آگے بڑھی۔

اُس نے پلٹ کر سپاہی کو دیکھا اور پھر تہمد والے شخص کو دیکھا۔ ان حضرت کو تو اُس نے پہچان لیا ایک دن ان سے بھی دوستی رہ چکی تھی۔ مگر رکھی کو ان کا نام یاد نہیں تھا ورنہ اس وقت پکار کر ذلیل کر دیتی۔

رکھی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ لوگ کیسے ظالم ہوتے ہیں۔ ایسی ہی غیرت آتی تھی تو آنکھیں بند کر لیتے۔ مجھے تو نہا لینے دیتے اور غیرت کیسی؟ میں ساری تو باندھے ہوئے تھی۔ یہی غیرت مند لوگ جب زنانے گھاٹ پر عورتیں نہاتی ہوں آکر پایا باندھ کر بیٹھتے ہیں اور خوب گھورتے ہیں۔ اس وقت غیرت نہیں آتی؟

رکھی کو اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ اس کی ماں دوپہر کو اس کے لئے گڑیاں بناتی تھی اور شام کو پابندی سے نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہناتی تھی۔ اگر کپڑے کھیل کود میں میلے ہو جاتے تو بہت بگڑتی تھی۔ پھر رکھی کو اپنا بچہ یاد آیا جو بارہ دن ہوئے دو بجے رات کو پیدا ہوا تھا، لڑکا تھا۔ بچارے نے ایک ہی بار "کہاؤں" کیا تھا کہ رکھی نے اس کا منہ، اس کی ننھی گردن، اور اس کا سارا بدن اپنی ساری سے لپیٹ دیا اور پھر وہ پوٹلی ایک گلی میں لیجا کر نالے کا منہ کھول کر اندر ڈال دی۔ اس کام میں سوہنی نے بھی ہاتھ بٹایا اور کیوں نہ بٹاتی؟

اس کو بھی کبھی نہ کبھی دن رکھی کی مدد کی ضرورت ہو گی۔ یوں ہی لوگ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں ــــ ہا ــــ بچہ کا بچہ گیا اور ساری کی ساری۔ اس وقت ہوتی تو نہا کر پہننے کے کام آتی۔ سر اور پیٹھ کے بھیگ جانے سے نہانے کا شوق اور تیز ہو گیا بلکہ اب تو رکھی کو ایک طرح کی ضد آ گئی کہ کچھ ہو نہا کر رہیں گے۔ چلو دریا چلو۔ لیکن وہ دور ہے دور ہی سہی کیا ہو گا کیا؟ راستہ میں تھک کر گر پڑیں گے؟ مر جائیں گے؟ اور اچھا ہے ایسی زندگی سے نجات ملے گی۔

ایک چائے کی دوکان پر کچھ بے فکرے بیٹھے قہقہے اڑا رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر رکھی سوچنے لگی کہ کاش ایسا ہوتا کہ یہ لوگ پکارتے!

"اہا ہا۔ کون جا رہا ہے؟"

"ایک نظر ادھر بھی!"

میں جواب تو نہ دیتی مگر اپنی لگاوٹ والی ایک نگاہ مار دیتی اور پھر اٹھلاتی، قدم پھینکتی آگے بڑھتی۔ پھر کوئی کہتا۔

"ارے ذرا ادھر آ تو جا۔ ارے بات تو سُن۔"

"سُن تو سہی کوئی تجھے کھا جائیگا کیا؟"

میں پلٹ پڑتی اور کہتی

"کیا غل مچا رکھا ہے۔ میں جا رہی ہوں دریا۔ نہانے۔ کیسی گرمی ہے! میل ہے کہ بدن کو کھائے جا رہا ہے۔"

چائے والا کہتا

"آؤ تو یہاں۔ یہاں نہالو۔"

میں کہتی

"باتیں نہ بناؤ"

پھر خود ہی گنگنانے لگتی

"ہٹو جاؤ، باتیں نہ بناؤ"

چائے والا" تمہاری جان کی قسم۔ ادھر دیکھو مکان کے اندر حوض بنا ہے"

چائے والا مجھ کو خوشامد درامد کر کے اندر لے جاتا تو وہاں سچ مچ ایک حوض ہوتا پھر چائے والا مجھ کو ایک ساری لا کر دیتا۔ اب میں چائے والے سے باہر جانے کو کہتی مگر وہ نہ مانتا اور ضد کرتا کہ میں تو اندر ہی ٹھہروں گا۔ آخر بڑی خوشامد کے بعد باہر جاتا اور میں خوب نہاتی، خوب نہاتی، پھر بالوں میں کنگھی کرتی ساری پہنتی

رکھی سوچنے لگی کہ اگر یہ خواب پورا ہو جائے تو کیا کہنا۔ بدن کیسا ہلکا ہلکا ہو جائے گویا دوبارہ زندگی مل جائے۔

(۲)

سورج ڈوبنے پر تھا اور پارک کی چہل پہل شباب پر تھی تال کے اس پار چھوٹے چھوٹے بچے تیتریوں کی طرح اِدھر اُدھر اُڑتے پھر رہے تھے اور غل مچا رہے تھے۔ ایک بچہ ایک کتے کی رسی پکڑے ٹہلا رہا تھا اور دوسرا کتے کی پیٹھ پہ بوسے کو سوار کر رہا تھا۔ انکی آیائیں گھاس پر ٹانگیں پھیلائے آدھی لیٹی آدھی بیٹھی اپنی اپنی بک بک میں کھوئی ہوئی تھیں۔ وہاں سے دور پہ دو تین نوجوان مرد اور عورتیں نمائشی کپڑوں میں لپٹے ایک دوسرے کو اپنے فقرے اور قہقہے سنا رہے تھے۔ دوسری طرف دس پندرہ سفید پوشوں کا مجمع تھا جس میں سے چار پانچ تال میں وضو کر رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب تال کے پاس اپنے

بارہ برس کے لڑکے کو لئے دوزانو بیٹھے نماز کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک طرف ایک کانسٹیبل اکیلا وقت گزاری کے لئے ٹہل رہا تھا۔ اس مجمع میں رکھی تانگی۔ اس نے اپنی منزل طے کر لی تھی۔ دریا قریب تھا۔ بندرگاہ پر کھڑے جہاز دکھائی دے رہے تھے۔ جہاز پر کام کرنیوالی مشینوں کی چھپ چھپ اور قلیوں کی چیخ و پکار صاف سنائی دے رہی تھی۔

دریا قریب تھا لیکن پارک کی اس چہل پہل اور اس فراغت سے بھرپور سماں نے رکھی کو ایسا پکڑا کہ یہ تھکی ہاری تال کے کنارے بیٹھ گئی اور اپنے دونوں پاؤں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پھیلا دیئے۔ نیلے تال کے اندر پھیلی ہوئی سبز بیل کے بیچ بیچ شام کے سُرخ بادلوں کا عکس تھا۔ تال ایسا دلکش تھا کہ جی چاہتا تھا کہ بس دیکھے ہی جاؤ۔ رکھی ذرا دیر تو کھوئی سی بیٹھی رہی۔ پھر کچھ سوچکر اُس نے جلدی جلدی ادھر ادھر دیکھا اور چھپ سے پانی میں اُتر گئی۔

کانسٹیبل یہ دیکھ کر چلاتا ہوا دوڑا۔ نمازیوں نے غل مچایا۔ مولوی صاحب نے لاحول پڑھی اور آیائیں چونک کر کھڑی ہو گئیں۔ سپاہی گھبرایا ہوا تال کے کنارے دوڑ رہا تھا اور چلا رہا تھا "ساری چالان ہو جائیگا۔ جیل میں ڈال کر سڑا ڈالی جائے گی"۔

وضو کرنے والوں کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ کانسٹیبل کو ڈانٹنے لگے کہ "اسے نکال! اسے نکال"۔ کانسٹیبل دیر سے یہی ارادہ کر رہا تھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نکالوں تو کیسے نکالوں۔

رکھی اپنے اوپر یہ نوخیز دیکھکر گھٹنوں گھٹنوں پانی میں سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔ جسم کے سارے اُتار چڑھاؤ ساری پر اُتر آئے۔ بیماری نے چہرہ ضرور چوس لیا تھا مگر بدن کا کس بل بہت کچھ باقی تھا۔ خوش پوش نوجوانوں کو یہ دیکھ کر ساتھ کی لیڈیوں کے سامنے شرم آنے لگی۔ وہ لوگ ادھر منھ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔

رکھی کے اس ناگہانی حملے سے سب حملہ آور ٹھٹک گئے۔ رکھی کے ہونٹوں پر دن میں پہلی

بار کامیابی ناچنے لگی۔ اب اس نے دوسرا حملہ کیا۔ وہ بھیڑ کو بھول کر اطمینان سے ساری ہٹا کر بدن ملنے لگی۔ آیاؤں نے بچوں کو کھینچا۔ مولوی صاحب نے اپنے لڑکے کو جو ٹکٹکی باندھے ادھر تک رہا تھا چٹاخ سے ایک تھپڑ رسید کیا۔ وہ بھوں بھوں رونے لگا۔ وضو کرنے والوں نے گردنیں جھکالیں اور وضو پھر سے شروع کیا۔ پولیس والا اس عورت کو پاگل سمجھ کر خاموشی سے اس کی حرکتیں دیکھنے لگا۔

رکھی حملہ آوروں کی پسپائی دیکھ کر بہت خوش ہوئی مگر اس کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ کانسٹبل اپنے اور ساتھیوں کو بُلا کر مجھے پکڑوا نہ دے۔ اس لئے وہ جلدی جلدی نہائی اور فتحیاب ہو کر نکل آئی۔ بدن پر ساری چپکی ہوئی تھی اور رکھی اٹھلاتی اپنا پسندیدہ گیت "راجہ جانی رے" گاتی ایک طرف کو چل کھڑی ہوئی۔ پولیس والا سوچتا ہی رہا کہ اس پاگل کو پکڑوں یا نہ پکڑوں مرد گھوم گھوم دیکھ رہے تھے کہ کہیں یہ پگلی ایسا تو نہیں کرتی کہ اپنی ساری نچوڑ کر سوکھنے کو پھیلا دے۔

دوسرا حصّہ

کہانیاں

میاں خول خول (چھوٹے بچوں کے لیے)

کالا دیو (بڑے بچوں کے لئے)

میاں خوں خوں

شہر میں ایک گھنا پیپل کا پیڑ تھا۔ اس پر رہتا تھا ایک بندر، گول گول منہ، لمبی لمبی دم، چم چم کرتی ہوئی آنکھیں۔

بندر ہر وقت کھیل تماشے کیا کرتا تھا۔ اچھلتا کودتا۔ طرح طرح کی آوازیں نکالتا۔ لڑکوں کی بات بات کی نقل کرتا اور لڑکیوں کا منہ چڑھاتا

بچوں نے اس بندر کا نام میاں خوں خوں رکھ دیا تھا۔

میاں خوں خوں کے گرد لڑکوں اور لڑکیوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ کوئی مٹھائی لا رہا ہے تو کوئی چٹپٹی پھلکیاں کھلا رہا ہے۔ یہ کھاتے تھے اور مزے کرتے تھے۔

ایک دن ایک لڑکے نے میاں خوں خوں کو رسی میں گرہ لگانا سکھائی۔ انہوں نے بات کی بات میں سیکھ لی۔ لڑکے نے خوش ہو کر کہا:۔

"واہ واہ! ہمارے میاں خوں خوں بھی کیسے عقل مند ہیں! اگر کہیں جنگل پہنچ جائیں تو بندروں کے بادشاہ بن جائیں۔"

یہ جو سُنا میاں خوں خوں نے تو دل میں کہنے لگے :-

"اب تو میں یہاں نہیں رہنے کا، میں تو جاتا ہوں جنگل کو —— وہاں ٹھاٹھ سے بندروں کا بادشاہ بن کر رہوں گا۔"

دوسرے دن صبح سویرے میاں خوں خوں شہر سے جنگل کو چل دیئے۔ کودتے پھاندتے درختوں پر اچکتے اچکلتے شام تک پہنچ گئے جنگل۔ وہاں بندروں سے کہنے لگے

"بندرو، بندرو۔ میں ہوں میاں خوں خوں۔ بڑا عقلمند ہوں۔ مجھے اپنا بادشاہ بنالو۔"

بندروں نے کہا "کوئی کمال دکھاؤ تو جانیں کہ ہو عقل مند۔"

میاں خوں خوں نے جواب دیا :-

"اچھا۔ اپنی عقلمندی دکھاؤں گا کسی دن۔"

(۲)

ایک دن میاں خوں خوں نے دیکھا کہ ایک مسافر بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔ آگے ایک ڈبے میں پسا ہوا مرچ رکھا ہے۔ انہوں نے کہا۔

"اہا ہا ہا۔ یہ تو بڑی اچھی چیز ملی۔ جنگل کے بندر بھلا کیا جانیں مرچ ابھی ان کو اس کا مزا چکھاتا ہوں اور اپنی عقلمندی جتاتا ہوں۔"

میاں خوں خوں نے ایک چھلانگ لگائی اور مسافر کے پاس سے ڈبہ اچک لیا۔ وہ بچارا ہش ہش کرتا رہا۔ یہ ڈبہ لے یہ جا وہ جا۔ جنگل میں غائب۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سب بندر ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھے تھے۔ بچے اُچک پھاند مچا رہے تھے۔ بندریاں جوئیں دیکھ رہی تھیں۔ بڑے بندر آرام سے لیٹے تھے۔

میاں خوں خوں چپکے سے درخت پر چڑھ گئے اور لگے اوپر سے مرچیں ہوا میں اڑانے بندروں کی آنکھ اور ناک میں جو پہنچی مرچیں تو لگیں چھینکیں آنے اور آنسو بہنے۔ سب گھبرائے کہ یہ کیا آفت آئی۔

بندروں نے ادھر دیکھا، ادھر دیکھا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ میاں خوں خوں اونچے درخت پر بیٹھے کوئی لال لال چیز ہوا میں اڑا رہے ہیں۔ بندروں نے کہا، ہو نہ ہو یہ چھینکیں اور یہ آنسو اسی لال لال چیز سے آ رہی ہیں۔ تب انہوں نے دوڑ کر میاں خوں خوں کو پکڑ لیا، پوچھا

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟"

میاں خوں خوں نے جواب دیا "تم کو دکھا رہے ہیں کہ ہم کو کیا آتا ہے۔ اب کہو ہیں ہم عقلمند؟"

اس پر بندر بہت بگڑے اور کہنے لگے :-

"ہماری تو آنکھیں پھوٹ گئیں اور تم کہتے ہو یہ عقلمندی ہے، کہیں عقل مندی ایسی ہوتی ہے۔"

بندروں نے میاں خوں خوں کو بہت برا بھلا کہا۔ میاں خوں خوں چپ ہو رہے دل میں کہنے لگے۔

"ٹھہر جاؤ، میں تم سے نہ منوا لوں کہ میں عقل مند ہوں تو میرا نام نہیں میاں خوں خوں"

(۴۳)

رات آئی۔ سب بندر سو رہے۔ میاں خوں خوں چپکے سے اٹھے اور ایک بندر کی دم دوسرے بندر کی دم سے، دوسرے بندر کی دم تیسرے بندر کی دم سے باندھ دی۔ اسی طرح دو دو بندروں کی دُمیں آپس میں باندھ دیں۔ پھر اپنی جگہ آکر سو رہے۔

صبح جب بندر سو کر اُٹھے تو بڑا شور ہوا۔ ایک بندر ادھر زور لگا رہا ہے دوسرا ادھر۔ ایک کہتا ہے "چھوڑو جی ــــ تم مجھے کیوں پکڑے ہو؟" دوسرا کہتا ہے "واہ وا! پکڑے ہو تم اور کہتے ہو مجھے، چھوڑو نہیں تو کاٹتا ہوں" ایک ادھر خوں خوں کر رہا ہے تو دوسرا ادھر۔

میاں خوں خوں مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے

بہت دیر کے بعد میاں خوں خوں نے سب بندروں کی دُمیں کھول دیں۔ جب بندر کھُل گئے تو میاں خوں خوں کہنے لگے۔

"کیوں بندرو، مانتے ہو کہ میں ہوں عقلمند؟"

بندروں نے کہا "آپ بڑے عقل مند سہی مگر ہمارے یہاں سے تشریف لیجائیے ہم کو ایسے عقل مند نہیں چاہئیں"

بندروں نے میاں خوں خوں کو دھکے دے کر اپنے یہاں سے نکال دیا۔

میاں خوں خوں جو نکالے گئے تو لگے ایک شاخ پر بیٹھ کر سوچنے کہ کیا کروں جو بندر میرا لوہا ماننے لگیں۔

سوچتے سوچتے ایک بات سمجھ میں آ گئی۔ تب تو یہ مارے خوشی کے خوں خوں کرنے لگے اور شہر کی طرف چل دیئے۔

میاں خوں خوں کودتے پھاندتے شام تک شہر پہنچ گئے۔ ادھر اُدھر گھومنے لگے۔ ایک جگہ بہت سی رسیاں رکھی تھیں۔ ان کو جو میاں خوں خوں نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔

"آہا ہا ہا۔ میں ایسی ہی چیز تو ڈھونڈھ رہا تھا"۔

میاں خوں خوں رسی لیکر جنگل کو واپس ہوئے۔

(۴)

بندروں کا ایک بہت بڑا دشمن تھا۔ اژدہا۔ تاڑ کا اتنا لمبا۔ بھینسے کا اتنا موٹا۔ وُہ جاڑوں بھر سوتا اور گرمیوں بھر جاگتا۔ جب بھوکا ہوتا تو بندروں کے درخت پر چڑھ آتا۔ اژدہے کو دیکھتے ہی بچارے بندروں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے جو جس جگہ ہوتا وہیں کا وہیں رہ جاتا۔ اژدہا جتنے بندر چاہتا نگل لیتا۔

آج بندر بچارے بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ کیونکہ کل سے گرمیاں آ رہی تھیں۔ اسلئے سورج نکلنے پر اژدہا جاگنے والا تھا۔ یہ خبر سن کر میاں خوں خوں کو ایک بات سوجھی اور وُہ شہر چل دیئے۔

میاں خوں خوں شہر سے جنگل کو واپس ہوئے تو چلتے چلتے رات ہو گئی۔ بھیانک جنگل اندھیرا اتنا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا۔ راستے میں ندی نالے پڑتے تھے۔ سانپ بچھو کا بھی ڈر تھا مگر میاں خوں خوں بھاگتے رہے۔ کیونکہ ان کو یہ دھڑکا لگا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گھر سے پہنچنے سے پہلے سورج نکل آئے۔ پھر اژدہا جاگ پڑیگا اور میرے کیے کچھ نہ

ہو سکے گا۔ وہ برابر بھاگتے رہے

بھاگتے بھاگتے، بھاگتے بھاگتے میاں خوں خوں اژدہے کے پاس پہنچ ہی گئے وہ ایک سوکھے ٹھونٹھ سے لپٹا سو رہا تھا۔ سورج کی پہلی کرن نکل آئی تھی، اس لئے کسمسا رہا تھا اور اٹھنے ہی والا تھا۔

میاں خوں خوں شہر سے ایک رسی لائے تھے۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کا پھندا اژدہے کے گلے میں ڈال دیا۔ پھر اسی درخت سے باندھ دیا۔

اژدہے نے منہ اٹھا کر انگڑائی جو لی تو پھندا گلے میں پھنس گیا۔ پھر تو جیسا جیسا وہ زور لگاتا، پھندا گلے کی پھانسی بنتا جاتا۔

اب تو لگا اژدہا زور زور سے پھنکاریں مارنے اور میاں خوں خوں کو دھمکانے۔ میاں خوں خوں ذرا نہیں ڈرے۔ اس کا منہ چڑاتے ہوئے وہاں سے چل دیئے۔

بندروں نے جو سنا اژدہے کا چیخنا تو ان کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے کہا، یہ نئی بات کیسی، آج تک اژدہا اس طرح نہیں چلایا۔ پھر تو چلے وہ ادھر درختوں میں چھپتے چھپاتے۔

وہاں پہنچ کر بندروں نے کیا دیکھا کہ اژدہے صاحب بکری کی طرح درخت سے بندھے ہوئے ہیں اور چلا رہے ہیں۔

بندروں نے جو یہ دیکھا تو بہت خوش ہوئے لگے اژدہے کو چڑانے

"کیوں جناب اژدہے صاحب؟ مزاج تو اچھے ہیں؟ آپ کی غریب خانے پر

تشریف نہیں لائے ؟ کیا ہم سے کچھ خفا ہیں ؟"

ایک نے کہا" لو لو ہے لو لو"

دوسرے نے کہا۔ "میں میں ہے میں میں"

بندر خوب خوب اچھلے کودے، ناچے تھرکے۔

اژدہے کا گلا کستے کستے اتنا کس گیا کہ اس کی سانس بند ہو گئی۔ وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا

بندروں نے کہا۔

"جس نے اژدہے کو باندھا ہے وہ بڑا عقلمند۔ مل جائے تو اپنا بادشاہ بنا لیں"

(۵)

بندروں کا جانی دشمن ایک اور بھی تھا، تیندوا، دہکتے انگاروں کی ایسی آنکھیں، چاقو کے ایسے ناخن، منہ ایسا ڈراؤنا کہ دیکھے لرزا چڑھے۔ وہ روزانہ درخت پر چڑھ آتا اور تین تین چار چار بندر پھاڑ کر کھا جاتا۔ اژدہا گرمیوں میں ستاتا تھا مگر یہ سال بھر۔

میاں خوں خوں اب اس گھات میں لگے کہ کسی طرح اس کا بھی خاتمہ کیا جائے۔

ایک دن میاں خوں خوں نے دیکھا کہ شکاری بندوق لئے گھوم رہا ہے۔ وہ کہنے لگے کیسی اچھی بات ہو جو تیندوا اس کے ہاتھ سے مارا جائے

شکاری گھومتا گھامتا تیندوے کی جھاڑی کے پاس آیا۔ وہ ایسی گھنی تھی کہ اندر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے تیندوے کو نہیں دیکھا۔

میاں خوں خوں پھلانگیں مارتے درختوں درختوں جھاڑی کے اوپر آگئے۔ نیچے جھانکا۔ دیکھا کہ تیندوے صاحب اپنی بیوی بچوں سمیت آرام سے سو رہے ہیں۔ میاں خوں خوں چپکے چپکے ایک نیچی شاخ پر اترآئے۔ اپنی

دم میں لگائی خوب سے پسی ہوئی مرچ۔ دم نیچے لٹکائی اور تیندوے صاحب کی ناک میں کر دی۔

تیندوے صاحب کی ناک میں مرچ کا لگنا تھا کہ اُنہوں نے زور سے کہا "آچ چھیں"۔

میاں خوں خوں اُچک کر دور جا پہنچے اور لگے بندروں سے پکار پکار کہنے "بھائیو، جلدی آؤ جلدی۔ نیا تماشا دیکھو"۔ سب بندر دوڑ آئے۔

تیندوے کی چھینک سے اس کی بیوی کی آنکھ کھل گئی اور اُس نے شکاری کو بھی دیکھ لیا وہ گھبرا کر کہنے لگی "ارے چپ چپ ——— شکاری"۔

تیندوے نے جواب دیا "آچ چھیں"۔

بیوی بگڑ کر بولی "ارے چپ چپ، کچھ پاگل ہوا ہے"۔

تیندوے نے کہا "آچ چھیں، آچ چھیں"۔

بیوی اور بگڑی اور کہنے لگی "ارے کمبخت شکاری نے دیکھ لیا"۔

تیندوے نے کہا "آچ چھیں۔ آچ چھیں، آچ چھیں، آچ چھیں"۔

شکاری نے تیندوے کو دیکھ لیا اور جھاڑیوں سے اس کو بندوق مار دی۔ وہ مر گیا اس کی بیوی اپنے بچوں کو لے کر اس جنگل سے بھاگ گئی

جتنے بندر تھے سب کے سب خوشی سے خوب خوب اچھلے کودے، خوب خوب ناچے تھرکے سب میاں خوں خوں کی عقلمندی کے قائل ہو گئے۔ جب بندروں کو معلوم ہوا کہ اژدہے کو بھی میاں خوں خوں ہی نے مارا ہے تو اور خوش ہوئے اور ان کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔

(پلاٹ کے چند حصے ایک زبانی کہانی سے متاثر ہیں)

کالا دیو

پورب میں اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن میں ایک بستی تھی جسے دُکھ پور کہتے تھے وہاں ایک ٹوٹے پھوٹے گھر میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ وہ دن بھر اپنے سوکھے ساکھے ہاتھوں سے چرخہ کاتا کرتی تھی چرخہ چوں چوں کرتا رہتا۔ بڑھیا کا سر ڈگ ڈگ ہلتا رہتا اور بڑھیا کے بالوں کا ایسا بھولا بھالا سفید سفید تاگہ نکل نکل کر تکلی میں لپٹتا جاتا۔ جب دن بھر کا تھکا ماندہ سورج پوربی پہاڑوں کی اوٹ میں چلا جاتا اور بڑھیا کے گھر کے موکھوں میں رہنے والے کبوتر دن بھر چر چگ کر بسیرا لینے گھونسلوں میں آجاتے تو بڑھیا اٹھتی اور اپنے دن بھر کے کاتے سوت کی گڈڑی بازار لے جاتی۔ اس کے دو چار پیسے جو ملتے اس کا آٹا دال لے کر گھر آتی۔

بڑھیا کا پندرہ سولہ برس کا ایک نواسا تھا جس کا نام ہنس تھا۔ وہ ہنس ہی جیسا سندر بھی تھا۔ کھیل میں لڑکیاں اس کو اس طرح گھیرے رہتیں جیسے سورج مکھی کے پھول کو تتلیاں جب اس کی نانی بازار چلی جاتی تو وہ شام کے سناٹے میں بیٹھا اس کا انتظار کیا کرتا۔ پھر جب نانی

آگ کو کھانا پکنے کو چڑھا دیتی تو یہ اس کی بغل میں بیٹھا آگ کے لپکتے شعلوں کو تاکتا رہتا۔ رات گئے تک جا کر کھانا تیار ہوتا۔ تب نانی، نواسہ دونوں سر جوڑ کر کھاتے اور پھر سونے لیٹ جاتے۔

پو پھٹتے ہی ہنس آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا اور بستی کے باہر پہاڑوں کے پاس جا پہنچتا۔ اس وقت شہد کی مکھیاں بھی اپنا چھتہ چھوڑ کر آ جاتیں اور پھولوں پھولوں اس کی کھوج میں ماری ماری گھومتیں۔ چڑیاں بھی اپنے گھونسلوں سے نکل کر ایک درخت سے دوسرے درخت پر اور دوسرے درخت سے تیسرے درخت پر اڑی پھرتیں اور اونچی چوں چوں سے سارا جنگل سر پر اٹھا لیتیں۔

تھوڑی دیر میں ایک ایک کر کے بستی بھر کے لڑکے لڑکیاں جمع ہو جاتے۔ یہاں پر یہ لوگ رنگ برنگی پتھر اور رنگ برنگی پھول اور ہری بھری پتیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے اور ان سے جھوٹ موٹ ..... کی پھلواریاں اور کھیت تیار کرتے اور پھر جھوٹ موٹ کی فصل کاٹتے اور اس کا جھوٹ موٹ کا کھانا پکا کر کھاتے۔ اس طرح کھیل کھیل میں ان کی بھوک بہل جاتی کیونکہ دکھ پور کے کسی گھر میں دن کو کھانا نہیں پکتا تھا۔ دن ڈھلتے ڈھلتے سب لڑکے لڑکیاں تھک کر چور ہو جاتے اور درختوں کی جڑوں پر بیٹھ کر پیلے سورج کے پہاڑوں میں چھپنے کی راہ تکنے لگتے۔ ادھر سورج نے کھو چھپا کر پہاڑوں کی اوٹ میں اپنا منہ چھپایا اور ادھر لڑکے خوشی سے کودتے پھاندتے، غل شور مچاتے، کھانے کو یاد کرتے گھروں کی طرف بھاگتے۔

ایک دن صبح کو ہنس نے جیسے ہی جانے کو کواڑ کھولے۔ اس کی نانی نے کہا

"میرے لال آج تو کہیں نہ جا۔ آج ایک تہوار ہے جس میں چھوٹے بچے باہر نہیں نکلتے ہیں اگر تو میرا کہنا مانے تو میں تجھے مٹھائی اور کھلونے دوں گی"۔

ہنس نے مدتوں سے نہ مٹھائی کھائی تھی اور نہ کھلونے کھیلے تھے۔ اس لئے ان کا نام سنتے ہی اس کا چہرہ سونے کی طرح دمک اٹھا اور وہ ہنس کر بولا: "اچھا نانی" ——— نانی اس کو

راضی پا کر خوش ہوئی اور باہر چلی گئی

صبح کے کوے دیر تک کاؤں کاؤں کرنے کے بعد اڑ گئے۔ دھوپ دیوار کے اوپر سے اترتے اترتے آنگن میں آگئی مگر ہنس کی نانی واپس نہ آئی۔ ہنس کی آنکھیں کواڑوں پر اور کان نانی کی چاپ پر لگے ہوئے تھے کہ کب نانی آئے اور کب مٹھائی کھانے کو اور کھلونے کھیلنے کو ملیں۔ جب بہت دیر ہو گئی تو ہنس کو اپنے کھیل کا میدان اور دوست یاد آنے لگے۔ اس نے سوچا اب نانی شام تک نہیں آئیں گی۔ اس لئے چلو کھیلنے چلیں۔ گھر کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس لئے یہ بندروں کی طرح دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود آیا ہنس یہ دیکھ کر بہت گھبرایا کہ بستی بھر کے گھر باہر سے بند ہیں۔ نہ کسی طرف چڑیوں کی چوں چوں ہے اور نہ کولہو کی چر چر۔ گلیاں اور بازار سائیں سائیں کر رہے ہیں۔ بستی کے باہر نہ تو باغوں میں رکھوالوں کی ہو ہو سنائی دیتی ہے اور نہ کھیتوں میں ہلواہوں کی ہٹ ہٹ ہنس اس سناٹے سے اتنا گھبرایا کہ اپنے کھیل کے میدان کی طرف بے تحاشا بھاگا۔ ابھی وہ میدان کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ایک بھیانک گرج سنی۔ سر جو اٹھایا تو دیکھتا کیا ہے کہ سامنے ایک کالا پہاڑ سا کھڑا ہے جو ہل رہا ہے اور بادل کی طرح گرج رہا ہے۔ ہنس اسے دیکھتے ہی سہم کر ایک پیڑ کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ پہاڑ نہیں تھا بلکہ ایک کالا دیو تھا جو پالتی مارے بیٹھا ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔ اسکی آنکھیں تنور کی طرح سلگ رہی تھیں۔ اس کے کالے کالے سینے پر خون سے لتھڑی لال لال زبان لٹک رہی تھی۔ اس کی دونوں بھوؤں کے بیچ میں ایک بہت اونچا نوکیلا سینگ تھا۔

اس سے بہت دور ہٹ کر بستی کے سارے آدمی سہمے ہوئے ایک دوسرے سے بھڑے کھڑے تھے۔

کالے دیو کے سامنے کھانے کی بڑی بڑی دیگیں کندوں پر لگی تھیں۔ وہ جلتی جلتی دیگ اُٹھاتا اور اپنے منہ میں انڈیل لیتا۔ نگلنے کے بعد جب ڈکار لیتا تو دھوئیں کے بھبکے منہ سے نکل کر ہوائی کی طرح آسمان پر چڑھ جاتے۔

جب سب دیگیں ختم ہو گئیں تو دیو بڑی زور سے گرجا۔ اس کی گرج سے جنگل اور پہاڑ تھرا اُٹھے۔ جنگلوں کے شیر اور بھیڑیے ڈر کر سیاروں کی ایسی چیخیں مارنے لگے۔ درختوں سے چڑیاں اور پہاڑوں سے عقاب چلاتے ہوئے آسمان کی طرف بھاگے۔ بستی والوں میں بہت سی عورتیں بیہوش ہو گئیں۔

دیو گرج کر بولا:۔

"بس اتنا ہی کھانا"

بستی والوں میں سات موٹے موٹے آدمی کھڑے تھے جنہوں نے گرج سنتے ہی اپنے ماتھے زمین پر ٹیک دیئے اور گڑگڑا کر بولے۔

"پار سال تک تو اتنا ہی دستور تھا"

دیو نے گرج کر کہا:۔

"دستور دستور کچھ نہیں، اب میری بھوک بڑھ گئی ہے"

سب بستی والے گڑگڑا کر بولے:۔

"اتنا ہی ہم لوگ ایک وقت کا ٹکڑا اکٹھا کر پاتے ہیں"

اس پر دیو اتنا بگڑا کہ اس نے ایک موٹے تازے جوان کو دو انگلیوں سے اُٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور گنڈیری کی طرح چبا کر خون پی لیا، پھر بچی کھچی ہڈیاں اور کھال کو ایک طرف تھوک دیا اس کے بعد گرج کر بولا:۔

"یہ سزا ہے ان لوگوں کی جو اپنے بھائی کو کھانا نہ کھلائیں"۔ پھر دیو اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

"دیکھو میرا پرانا حکم یاد ہے۔ تم لوگ تین طرف جانا مگر چوتھی طرف نہ جانا"۔

دیو چھلانگیں مارتا ایک طرف بھاگا۔ اس کے بھاگنے سے بھونچال آگیا۔ ہرن چوکڑیاں بھول گئے۔ پہاڑوں سے چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگیں اور سانپ گھبرا کر بلوں سے باہر نکل پڑے۔

دیو کے جاتے ہی بستی والوں میں کہرام مچ گیا۔ عورتیں چلّا چلّا کر رونے لگیں اور دیو کو کوسنے لگیں جو آدمی چبایا گیا تھا۔ اس کی بیوی بچّے ماں باپ اس کی بچی کھچی لاش پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ رونے لگیں۔ پہاڑوں کی برف سے لدی چوٹیاں افسردہ ہو گئیں اور آسمان ترس بھری نگاہوں سے بستی والوں کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ بوڑھے لوگوں نے جا کر رونے والوں کو دلاسا دیا اور سمجھایا بجھایا کہ قسمت میں جب یہی لکھا ہے تو کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔

سارے بستی والے رو رہے تھے مگر ساتوں موٹے آدمی کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے۔ دیکھو ہم کہتے نہ تھے کہ اب کی سال اپنے بھائی کی دعوت میں زیادہ دیگیں رکھو سال بھر تو وہ ادھر ادھر سے کھاتا پھرتا ہے۔ صرف ایک دفعہ یہاں آتا ہے۔ اس پر بھی اسکو پیٹ بھر کھانا نہ ملے۔ تم ہمارے کہنے پر نہ چلے اس کی سزا مل گئی۔

دوسرے دن جب سب لڑکے لڑکیاں آ کر کھیل کے میدان میں جمع ہوئے تو ہنس نے جو کچھ دیکھا تھا۔ سب کو کہہ سنایا یہ سن کر سب سناٹے میں آ گئے۔ لڑکیاں ڈر کے مارے لڑکوں سے بھڑ کر بیٹھ گئیں اور سب نے بہت چھوٹا حلقہ بنا لیا۔ اس روز کسی کو کھیل کود کا دھیان تک نہ آیا۔ رنگ برنگی پتھر بکھرے پڑے رہے۔ رنگ برنگی پھول درختوں پر لگے رہے

مرجھاتے رہے۔ آج ان باتوں کا ہوش ہی کس کو تھا؟

اُس دن سے پھلواری لگانے اور کھیت اُگا کر فصل کاٹنے کا کھیل گیا۔ اب ان لڑکوں میں سے ایک تو جھوٹ موٹ کا کالا دیو بنتا اور باقی لڑکے لڑکیاں بستی والے بنتے اور اس کے مارنے کی طرح طرح کی ترکیبیں کرتے رہتے۔

چار مہینے کے بعد جب کھیت کٹے اور غلّہ کھلیان میں اکٹھا ہوا تو ساتوں موٹے آدمی جو اپنے کو کالے دیو کا دوست بتاتے تھے کھلیان کا جائزہ لینے لگے اور ہر شخص پر حکم لگانے لگے کہ تم چار دیگیں دینا اور تم پانچ دیگیں دینا۔

ساتوں موٹے آدمی نہ کھیتی باڑی کرتے تھے اور نہ کولہو چلاتے تھے۔ وہ کھیل تماشوں میں دن گنوایا کرتے تھے۔ جب فصل کٹتی تھی تو دیو کی دیگوں کے ساتھ یہ لوگ اپنا حق بھی وصول کر لیتے تھے۔ کوئی ان کی بات ٹال نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ ٹھہرے کالے دیو کے دوست۔

یہ بِپتا دیکھتے دیکھتے چند ہی مہینوں میں سب لڑکے لڑکیاں اپنا لڑکپن کھو بیٹھے۔ ان کی بھولی پیشانیوں پر فکروں نے جالا تان دیا۔ آخر ایک دن ہنس اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔

"بھائیو، اس کالی بلا نے تو ساری بستی ناس کر دی ہے۔ اس کا نام سُن کر ماؤں کا دودھ سوکھ جاتا ہے اور بچے بھوکے بلک بلک کر مر جاتے ہیں۔ آؤ کسی ترکیب سے اُس کو مار ڈالیں"

یہ سُن کر لڑکوں کے پھول ایسے چہروں پر پہاڑ کی ایسی سنجیدگی آگئی۔ ان کی آنکھیں کنول کی طرح کھلی کی کھلی رہ گئیں اور سب اپنی اپنی ترکیبوں میں غوطہ لگانے لگے۔ آخر سب نے مل کر یہ سوچا کہ کسی طرح کالے دیو کا گھر ڈھونڈھ نکالیں پھر رات کو جب وہ سو تا مل جائے، اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ تب اس کو راستہ نہیں سوجھے گا اور پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر مر جائیگا مگر سوال یہ تھا کہ اس کا گھر کیسے معلوم ہو۔ اس پر ہنس نے کہا کہ کالے دیو نے یہ کیوں حکم دے

رکھا ہے کہ تین طرف جانا چوتھی طرف نہ جانا۔ ہو نہ ہو چوتھی طرف اس کا گھر ہے۔ یہ سنتے ہی سب اُچھل پڑے اور بولے ہو نہ ہو یہی بات ہے۔ پھر تو یہ طے پایا کہ آج ہی آدھی رات کو سب اپنے اپنے گھروں سے چھپ چھپ کر نکل آئیں اور اسی میدان میں جمع ہو جائیں۔ سب مل کر یہاں سے چل کھڑے ہوں اور صبح ہوتے ہوتے اتنی دور نکل جائیں کہ کوئی نہ پا سکے۔ اس ترکیب کے سوجھ جانے سے سب خوش ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ ایسے میں ایک نے کہا۔ آؤ آج پھر اپنا پھلواریوں اور کھیت والا کھیل کھیلیں۔ اب کل سے نہ معلوم ہم لوگ کہاں ہوں۔ سب نے سنتے ہی کہا۔ ہاں ہاں اور رنگ برنگی پتھر رنگ برنگی پھول اور ہری بھری ٹہنیاں جمع کرنے لگے۔

جب آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر تھی۔ ستارے پیرتے پیرتے آدھے آسمان تک پہنچ چکے تھے اور سوائے الو اور سیار کے ہر جاندار سو رہا تھا۔ ایک ایک کر کے لڑکے اور لڑکیاں کھیل کے میدان میں اکٹھے ہونے لگے۔ ان کی چاپ سے بھڑک کر چڑیاں گھونسلوں سے منہ نکال نکال کر دیکھنے لگیں کہ کیا ہونے والا ہے۔

جب سب اکٹھے ہو گئے تو یہ ٹھہری کہ لڑکیوں کو ساتھ نہ جانا چاہئے۔ کون جانتا ہے کہ کیسی بپتا جھیلنا پڑے۔ لڑکیاں اس پر راضی نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ جیسی پڑے گی ہم بھی لڑکوں کی طرح جھیل لیں گے مگر جب لڑکوں نے بہت اونچ نیچ دکھائی تو لڑکیاں مان گئیں۔ لڑکوں سے جدا ہوتے وقت ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور جب لڑکے پیڑوں کے سائے کی کالی چادر کے اندر گم ہو گئے تو وہ پھوٹ پھوٹ رونے لگیں۔

رات کی او۔ پیڑوں کی کالی چادر سارے جنگل کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ صرف کبھی کبھی پیڑوں کے پیچھے سے ستاروں کی جھلملاہٹ دکھائی پڑ جاتی تھی۔ سوکھے پتوں پر

سانپوں کے رینگنے کی سرسراہٹ سنائی دیتی تھی۔ ادھر اُدھر سے شیروں کے دھاڑنے کی آوازیں آرہی تھیں مگر بات کے دھنی لڑکے ذرا نہیں ڈرے اور قدم بڑھائے چلے گئے۔ چلتے چلتے صبح ہو گئی۔ جب روشنی پھیلی تو دیکھتے کیا ہیں کہ ویران بیابان ہے۔ جہاں نہ آدم نہ آدم زاد صرف خدا کی ذات۔ بیچ میدان میں ایک ٹوٹی قبر ہے۔ جس کے سرہانے مولسری کا درخت لگا ہوا ہے اس کی مہک سے سارا میدان بسا ہوا ہے۔ اس درخت پر ایک مور بیٹھا مولسری کے پھول چگ رہا ہے۔ جب یہ لڑکے قریب پہنچے تو مور نے کہا۔

"لڑکو! ادھر کہاں جا رہے ہو؟"

لڑکوں نے کہا "ہم کالے دیو کا گھر ڈھونڈھنے نکلے ہیں۔"

مور نے پوچھا "اس کے گھر جا کر کیا کرو گے؟"

لڑکوں نے جواب دیا "جب گھر میں ہم اس کو سوتا پائیں گے تو اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالیں گے۔ پھر وہ پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر مر جائے گا۔"

مور یہ سنکر ہنسا اور کہنے لگا۔

"کالے دیو کا کوئی گھر نہیں۔ وہ ہمیشہ گاؤں گاؤں بستی بستی مارا مارا گھومتا ہے۔" یہ سنکر لڑکوں کی آس ٹوٹ گئی۔ ان کے چہرے کملا گئے اور وہ نڈھال ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر مور بولا:۔

"تم بے آس نہ ہو، کالے دیو کو مارنے کی ایک ترکیب ہے۔"

لڑکے خوش ہو کر بولے "وہ کیا ہے؟"

مور نے "وہ یہ کہ تم تیر کمان کے درخت کا بیج لے آؤ اور اسے لا کر اپنی بستی میں بو دو۔ بوتے ہی درخت اُگ آئے گا اور بات کی بات میں بڑھ کر پھل لے آئے گا۔ جب تیر کمان

پھل آئیں تو انہیں توڑ توڑ کر بستی والوں میں بانٹ دو، اور کہو جب کالا دیو آئے تو سب اس پر ایک ساتھ تیر چھوڑ دیں۔ اس درخت کے تیر کالے دیو کے خون کے پیاسے ہیں۔ یہ جنگی سے چھوٹتے ہی ایک کروڑ کالے دیو کے بدن میں گھس جائیں گے۔ اس کا سب خون پی لیں گے اور وہ اسی دم مر جائیگا۔

لڑکوں نے پوچھا کہ تیر کمان کا درخت کہاں ہے اور اس کا بیج کیسے ملیگا؟

مور نے کہا: "تیر کمان کا درخت ایک پہاڑ پر ہے۔ جس کے راستے میں قدم قدم پر خطرے ہیں۔ اگر کوئی سب خطروں کا سامنا کرتا ہوا پہاڑ پر پہنچ جائے تو وہاں اسے تیر کمان کا درخت نظر آئیگا جس کے بیج زمین پر پڑے ہوں گے۔"

لڑکوں نے کہا: "تم راستہ بتاؤ، ہم وہاں ضرور جائیں گے اور جیتے جی ہار کر واپس نہ آئیں گے۔"

مور نے اپنی دم کا ایک پر نکال کر جو انہیں اڑا دیا اور کہا: "جدھر جدھر یہ پر جائے، ادھر ادھر تم لوگ جاؤ، مگر خبردار، کچھ ہو جائے راستے سے نہ ہٹنا۔"

لڑکوں نے مور کا شکریہ ادا کیا اور پر کے پیچھے پیچھے چلے۔ جب بھوک لگتی تو پیڑ درختوں کے پھل کھاتے تھے اور پیاس لگتی تھی تو ندی نالوں کا پانی پیتے۔ اگر پھل پھلاری اور ندی نالے نہ ملتے تو بھوکے پیاسے ہی چلتے رہتے۔ رات کو پر کسی درخت پر رک جاتا اور یہ بیٹھ کے اسی درخت کے سایہ میں سو رہتے۔ اسی طرح دن سے مہینے ہوئے اور مہینوں سے سال، یہ لوگ بھی بڑھتے بڑھتے جوان ہو گئے۔ چلتے چلتے ایک دن یہ لوگ ایک ریگستان میں جا پہنچے۔ یہاں درختوں کے بجائے سوکھے سوکھے ٹھنڈ کھڑے تھے۔ غبار کی ایسی دھندلی دھندلی چاندنی پھیلی تھی اور ہر طرف الّو کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ کالے کالے چمگادڑوں کے جھنڈ کے جھنڈ بڑی تیزی سے ادھر

سے اُدھر اور ادھر سے ادھر اڑ اڑ کر آ جا رہے تھے۔ ہنس تھوڑی دور گیا تھا دیکھتا کیا ہے کہ میرا گھر سامنے ہے دالان میں نانی بیٹھی چرخہ کات رہی ہیں۔ چرخہ چوں چوں کر رہا ہے۔ نانی کا سر ڈگ ڈگ ہل رہا ہے اور نانی کے بالوں کا ایسا سفید سفید بھولا بھالا تاگا نکل نکل کر تکلی پر لپٹ رہا ہے۔ اتنے میں ہنس کی نگاہ زمین پر پڑی تو دیکھا کہ ایک کالا سانپ پھن کاڑھے نانی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہنس نے گھبرا کر پکارا

"نانی، نانی، نانی"

مگر نانی کاتنے میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اُس نے آواز نہیں سُنی۔ ہنس نے چاہا کہ میں دوڑ کر سانپ کو مار ڈالوں کہ ہوا میں ایک شرارت بھری ہنسی کی آواز سنائی دی۔ ہنسی کی آواز سن کر وہ چونک پڑا اور اسے یاد آ گیا کہ میں جنگل میں ہوں۔ یہاں میرا گھر کہاں؟ ہو نہو مجھے کوئی بتلائے ہوتے راستے سے بہکانا چاہتا ہے۔

یہ بھوتوں کا بن تھا اور یہاں سب کو ایسی ہی تصویریں دکھائی دیں۔ کسی نے دیکھا کہ ہمارے ماں باپ گھر میں بیٹھے ہیں اور گھر کی دیوار گرا چاہتی ہے۔ کسی نے دیکھا کہ گھر کے سب لوگ سو رہے ہیں اور ایک چور رسّے کر گھر کی۔ اری پونجی سمیٹ کر باندھ لی ہے اور دیوار پھاند کر جانے ہی والا ہے۔ یہ جھوٹی تصویریں دیکھیں تو سب نے مگر کوئی اپنے راستے سے بہکا نہیں۔ کیونکہ ہنس نے جو کچھ دیکھا تھا سب کو سمجھا دیا تھا کہ ہم کو سیدھی راہ سے ہٹانے کی یہ سب چالیں ہیں خبردار اس جال میں نہ پھنسنا

آدھی رات گذرنے پر ان کو آگ کے بڑے بھیانک چہرے اور جانور ہوا میں ناچتے نظر آئے۔ ایک بار انہوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا پردار گھڑیال ہاتھی کی طرح چنگھاڑتا آسمان سے منہ کھولے چلا آ رہا ہے۔ آتے آتے وہ اتنا پاس آ گیا کہ یہ ڈگ ڈرے کہ

کہیں پاس آکر وہ ہم سب کو نگل نہ جائے مگر ڈرنے پر بھی کوئی بھاگا نہیں گھڑیال قریب آتا گیا۔ جب بالکل پاس آگیا تو اک دم سے غائب ہوگیا۔ تب جا کر ان لوگوں کی جان میں جان آئی

جیسے سورج نکلا۔ سب کھنڈ اور جانور غائب ہو گئے۔ اب جہاں تک نظر کام کرتی تھی نیچے بیابان ہی بیابان تھا اوپر آسمان ہی آسمان۔ یہاں سے وہاں تک گھانس پھونس تھی اور نہ پنکھ پکھیرو۔ یہ لوگ آگے بڑھتے گئے۔ سورج اوپر چڑھتا گیا اور گرمی بڑھتی گئی۔ ہوتے ہوتے زمین توے کی طرح تپنے لگی اور بالو چنگاریوں کی طرح جلنے لگی۔ لڑکوں کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے اور زبان سوکھ کر باہر لٹک آئی۔ ان کو چلتے چلتے ایک پورا دن ایک پوری رات گذر چکی تھی اور اب دوسرا دن جا رہا تھا۔

ٹھیک دوپہر تھی اور سورج کی ہر کرن لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخ معلوم ہو رہی تھی کہ لڑکے دیکھتے کیا ہیں کہ کچھ دور پر ایک باغ لگا ہے۔ جہاں ہری بھری گھاس ہے۔ گھنی چھاؤں کے درخت لگے ہیں۔ درختوں میں جھولے پڑے ہیں ان میں خوبصورت لڑکیاں جھول رہی ہیں اور ملاریں گا رہی ہیں۔ ایک طرف طرح طرح کے کھانے چنے ہیں اور اس کے پاس برف سے بھری صراحیاں رکھی ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر لڑکے دیوانوں کی طرح ادھر بھاگے ہنس نے دوڑ کر کسی نہ کسی طرح ان کو روکا اور کہا ذرا دیکھو تو یہ کو۔ وہ کدھر جا رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر باغ میں جا کر کسی آفت میں گھر جاؤ۔ سب لڑکے تو مان گئے مگر دو لڑکے نہ مانے اور باغ کی طرف چلے گئے۔ .... جیسے ہی وہ باغ کے اندر پہنچے باغ معہ ان کے غائب ہو گیا۔ سب سمجھ گئے کہ ہمارے یہ دونوں ساتھی اپنی جان سے گئے۔

تیسرے پہر کے قریب یہ لوگ ایک آگ کے دریا کے پاس پہنچے۔ جس کے شعلے آسمان تک پہنچ رہے تھے۔ آسمان میں ڈوب جانے والی چڑیاں بھی اگر دریا کے اوپر آجاتیں تو جل بھن کر اسی میں گر جاتیں۔ اس کو دیکھ کر سب لڑکے کانپ گئے مگر مور کا پر اڑتا ہوا سیدھا دریا کے اندر چلا گیا۔ ہمت کر کے ہنس اور اس کے ساتھی بھی ادھر بڑھے۔ دیکھا تو دریا کے اندر ایک لکڑی کا بجرا کھڑا ہے جس پر پر جا کر اٹک گیا ہے۔ اس دریا کو دیکھ اس بجرے کو دیکھ کر سب ٹھٹکے اور کہنے لگے کہ ہم تو اس بجرے پر نہ جائیں گے ہنس نے سب کو سمجھایا کہ ہم تو جان پر کھیل کر گھر سے چلے ہیں اور یہ طے کر چکے ہیں کہ ناکام لوٹنے سے مر جانا بہتر ہے۔ اسی بجرے پر چلو اگر بچ گئے تو بیر کماں کے درخت کے بیج لے آئیں گے اگر مر گئے تو ناکامی کے داغ سے بچ جائیں گے ہنس کے سمجھانے بجھانے سے لڑکے مان گئے اور اسی بجرے پر سوار ہو گئے اور بجرا کھینے لگے۔ آگے بڑھ کر آگ کی اونچی اونچی لہریں اور بڑے بڑے جھونکے ملے مگر لڑکے دل مضبوط کئے بیٹھے رہے۔

جب سورج ڈوب رہا تھا تو بجرا کنارے جا لگا۔ لڑکے اتر کر دیکھتے کیا ہیں کہ نہ تو آگ کا دریا ہے اور نہ بجرا۔ سب کے سب ایک ہرے بھرے جنگل میں کھڑے ہیں۔ چاروں طرف پھولوں سے لدی جھاڑیاں کھڑی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جھرنے میٹھا راگ الاپ رہے ہیں چڑیاں چہچہا رہی ہیں اور شاخوں پر بیٹھی ہوا میں جھولا جھول رہی ہیں۔

اسے دیکھتے ہی لڑکے ساری مصیبت بھول گئے اور ہنستے کھیلتے گاتے بجاتے پر کے پیچھے پیچھے چلے۔ اب پر ان کو ایک سرسبز پہاڑ کے اوپر لے گیا۔ یہاں ایک بہت بڑا درخت لگا تھا۔ جو آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ جس کی چھاؤں میں کئی ہزار آدمی سو سکتے تھے۔ درخت کی ہزاروں شاخوں سے روئی کے گالوں ایسے سفید سفید بیج برس رہے تھے۔ جن کو روئی ہی

کہ ایسے سفید سفید ہنسوں کی ٹولیاں چمک رہی تھیں اور خوشی سے شور مچا رہی تھیں ہنس نے ہش ہش کرکے ان کو بھگا دیا اور لڑکوں نے بہت سے بیج چن چن کر اپنے دامنوں میں بھر لیے۔

پر اب بھی اڑنا چلا جا رہا تھا۔ اب کی وہ پہاڑ کی دوسری طرف سب کو لیکر چلا۔ رات بھر یہ لوگ پہاڑ پر سے اترتے رہے۔ اترتے اترتے جب صبح کی روشنی پھیلی تو دیکھتے کیا ہیں کہ سامنے ایک بستی ہے جس کے باغ، کھیت اور گھر سب جانے پہچانے سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تیزی سے اترنے لگے تھوڑی ہی دور جب اور اتر آئے تو ان کو پتہ چلا کہ اپنے دیس پر پہنچ گئے۔

سورج ابھی اچھی طرح اونچا نہیں ہوا تھا کہ لڑکے اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔ ان کو نکلے برسوں گذر چکے تھے۔ اور ماں باپ اور ان کے ساتھ کی لڑکیاں ان کی واپسی کی طرف سے مایوس ہو گئی تھیں۔ بہتوں کی تو رونے رونے آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی تھی۔ ہنس کی نانی بیچاری تو بالکل اندھی ہو گئی تھی۔ اب جو لڑکے کامیابی سے مست اور خوشی سے ناچتے ہوئے گھر پہنچے تو سب کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ جن کی آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی تھی ان کی روشنی بڑھ گئی۔ ہنس کی نانی کی آنکھیں پھر سے روشن ہو گئیں۔

لڑکوں نے آتے ہی تیر کمان کا بیج بو دیا۔ شام ہوتے ہوتے وہ بیج اگ آیا۔ دو دن میں پودے سے پیڑ بن گیا اور ہفتہ بھر میں اتنا پھیلا کہ سارا گاؤں اس کے سایے میں آ گیا۔ جنگل کی چڑیوں نے جنگل چھوڑ کر اس میں اپنے گھونسلے بنا لئے۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے اس میں جھولے ڈالے۔ کچھ ہی دن اور گذرے تھے کہ اس میں پھول آ گئے جس سے سارا گاؤں جگمگا اٹھا۔

ساتوں موٹے آدمی ہر روز درخت کو دیکھتے تھے اور ہنس ہنس کہتے تھے کہ کہیں درختوں میں تیر کمان پھلتے ہیں!

کچھ دنوں کے بعد درختوں میں پھل آنے لگے اور پھلوں کی شکل تیر کمان ایسی تھی۔ ساتوں موٹے آدمی ان کو دیکھتے اور ہنس ہنس کر کہتے، بھلا ان پھلوں سے کوئی شکار کھیل سکتا ہے!

دیو کے آنے کا دن جیسا جیسا قریب آتا جاتا تیر کمان بڑے ہوتے جاتے جب وہ خوب بڑے ہو گئے تو ہنس نے اور سب لڑکوں نے درخت پر چڑھ کر تیر کمان توڑ لئے اور گاؤں والوں کو بانٹ دیئے

ساتوں موٹے آدمی ان تیر کمانوں کو دیکھ کر ہنستے تھے اور کہتے تھے، بھلا ان سے کالا دیو مر سکتا ہے!

جس دن دیو آنے والا تھا، صبح ہی سے سب گاؤں والے تیر کمان توڑ، ہاتھ میں لے، گھیرا باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اب کی نہ تو کھانے کی دیگیں تھیں اور نہ سہمے ہوئے لوگ۔

دن چڑھے زلزلہ آیا۔ پہاڑوں سے چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ گرنے لگیں، سانپ گھبرا کر بلوں سے باہر نکل آئے جنگل کے ہرن چوکڑیاں بھول گئے۔ کالا دیو غراتا، شور کرتا آ پہنچا۔

کالے دیو نے جب دیکھا کہ اس بار اس کے کھانے کو ایک دیگ بھی نہیں تو بڑی زور سے گرجا۔ لیکن ابھی اس کے حلق سے پوری آواز نکلی بھی نہ تھی کہ چٹکیوں سے تیر چھوٹ گئے اور چاروں طرف سے اس کے بدن میں پیوست ہو گئے۔ دیو کھڑا کا کھڑا رہ گیا پھر اکبارگی 'ہائے' کہہ کر چیخ کر زمین پر آ رہا۔

اس کے مرتے ہی سب کو وہ خوشی ہوئی کہ کئی مہینے تک اس میدان میں ناچ رنگ ہوتا رہا اور سب ہنستے کھیلتے رہے۔ لڑکیاں ہر روز پھولوں کے بڑے بڑے ہار بناتیں اور لڑکوں کے گلے میں ڈالتیں۔

ساتوں موٹے آدمی ایک کونے میں گم سم بیٹھے سب دیکھتے رہتے +

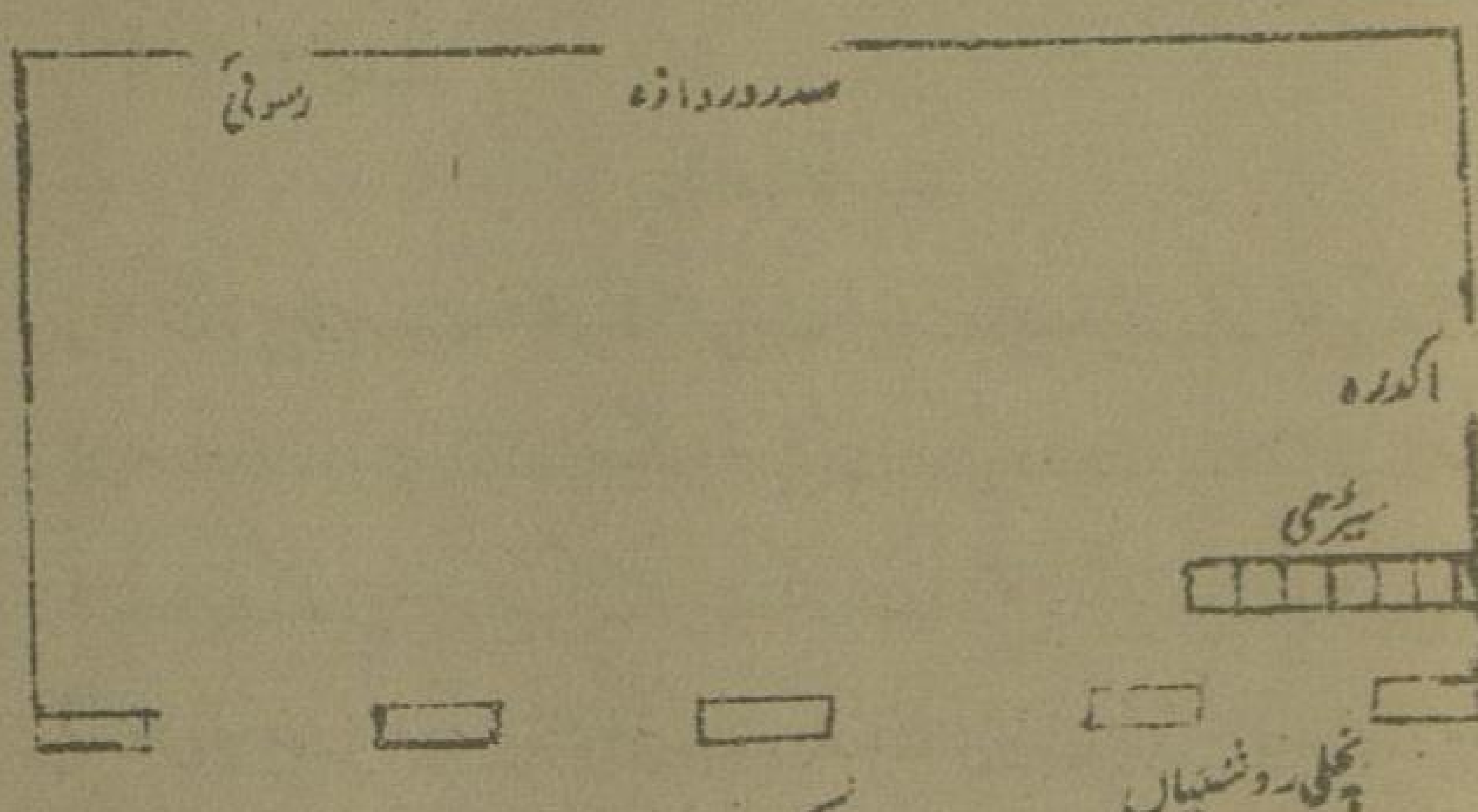
ڈرامے

(۱) بھوت گھر

(۲) آپ ہی میاں دردربار
آپ ہی میاں کھیت کھلیان

بھوت گھر

اسٹیج کا نقشہ



کردار

ماسٹر صاحب	دیہاتی اسکول کا ایک ماسٹر
گوکل	طالب علم
رگھو	"
بہادر	"
نہال	"
مہاراج	جنتر منتر کرنے والا ایک مہاراج

تمہید

[دیہاتی اسکول کا ایک ماسٹر اپنے اسکول کے چار طالب علموں کو لے کر مڈل کا امتحان دلانے شہر آتا ہے۔ یہاں ایک محلے میں کرائے کا مکان لے کر رہتا ہے۔ محلے والے بتاتے ہیں کہ یہ گھر آسیب زدہ ہے۔ اس خبر سے طالب علم بہت پریشان ہوتے ہیں اور ایک رات اتنا ڈر جاتے ہیں کہ گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ دوسرے دن مہاراج کو بلا کر لاتے ہیں]

پردہ اٹھتا ہے

[رات کا پہلا پہر ہے۔ مکان کا صحن ہے۔ سامنے ایک دیوار ہے۔ جس کے وسط میں صدر دروازہ ہے اور دروازہ کے بائیں طرف رسوئی کا دروازہ ہے، صحن کے داہنی طرف دیوار کے بیچ میں ایک اکدرہ ہے۔ اکدرے اور نچلی روشنیوں کے درمیان بارہ ڈنڈوں کی ایک بانس کی سیڑھی لگی ہے جو اکدرے کی چھت پر ختم ہوتی ہے۔ صحن کے بائیں طرف صرف دیوار ہے۔

رسوئی کے اندر اندھیرا ہے۔ اس کے دروازے کے پاس سل بٹہ رکھا ہے اور اندر تھالیاں چمک رہی ہیں۔ اکدرے میں دیوار سے لگا ایک صندوق رکھا ہے۔ جس پر کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ صحن میں پھٹے ہوئے کاغذ بکھرے ہیں۔ مکان بالکل خالی ہے۔ صدر دروازہ بند ہے۔ روشنی بہت دھیمی ہے]

[ذرا دیر کے بعد صدر دروازے کے باہر سے آوازیں آنے لگتی ہیں مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی ہے]

ماسٹر صاحب۔ (اونچی آواز میں جو تماشائیوں کو سنائی دیتی ہے) ارے مہاراج ساتھ ہو
پھر بھی ڈرتے ہو۔

[کنڈی کھڑکھڑاتی ہے۔ ماسٹر صاحب صدر دروازہ کھولتے ہیں۔ ان کے پیچھے
مہاراج کھڑے ہیں۔ ان دونوں کے پیچھے چاروں طالب علم ہیں

ماسٹر صاحب اوسط قد کے ہیں۔ دبلا بدن ہے۔ سر پر انگریزی بال ہیں۔ حرکات و
سکنات میں عجلت ہے۔ دھوتی باندھے ہیں جس کے نیچے لنگوٹ ہے۔ اوپر کرتہ اور
اُس کے اوپر بنڈی پہنے ہیں۔

مہاراج۔ لمبا قد۔ دبلا بدن۔ لمبی داڑھی۔ جٹا دھاری۔ جیت لنگوٹ باندھے بھبوت
ملے، کھڑاؤں پہنے، ایک ہاتھ میں میلا سا تھیلا اور دوسرے میں چمٹا۔ آنکھیں چمکتی ہیں
اور حلقوں کے اندر تیزی سے حرکت کرتی ہیں۔ سنبھل سنبھل کر بات کرتے ہیں

گوکل۔ چاروں طالب علموں میں سب سے بڑا اور سنجیدہ۔ گھٹا سر۔ اس پر بڑی سی چوٹی ——
دھوتی اور کرتہ پہنے ہے۔

رگھو۔ معمولی طالب علم۔ لباس پاجامہ اور کرتہ، آنکھوں پر عینک ننگے سر، انگریزی بال
جو اُلجھے ہوئے ہیں۔

بہادر۔ معمولی طالب علم۔ لباس دھوتی رنگین کھدر کا کرتہ، کھدر کی ٹوپی۔

نہال۔ سب سے کمسن طالب علم۔ گھٹنا اور رنگین قمیص۔ انگریزی بال جو تیل سے خوب
بنے ہوئے ہیں]

مہاراج (جیسے دروازہ کھلتا ہے چمٹا بجانے لگتے ہیں اور اس کی تال پر دھیمی آواز میں جاپ
کرتے ہیں)

بجرنگ بجرنگ۔ بجرنگ۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ
بجرنگ بجرنگ بجرنگ بجرنگ بجرنگ بجرنگ،

ماسٹر صاحب۔ اندر چلیے مہاراج۔

مہاراج۔ تم چلو بیٹا۔ بجرنگ، بجرنگ بجرنگ . . .

[ماسٹر صاحب اندر داخل ہوتے ہیں۔ رسوئی کی طرف دیکھتے ہوئے کمرے کے برابر جاکر کھڑے ہو جاتے ہیں]

ماسٹر صاحب۔ آئیے مہاراج

مہاراج (طالب علموں سے) چلو بیٹو چلو۔۔۔۔ چلو، ڈرتے کیا ہو۔

گوکل (دروازے کی طرف بڑھ کر تینوں طالب علموں سے) آؤ۔۔۔ مہاراج ہیں تو پھر ڈر کس بات کا۔

مہاراج۔ ہاں ہاں چلو۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ . . . . .

[مہاراج رگھو، نہال اور بہادر کی پیٹھوں پر باری باری ہاتھ رکھ کر ان کو اندر کی طرف بڑھاتے ہیں۔ چاروں طالب علم صدر دروازے سے نکلتے ہیں۔ نہال رسوئی کی طرف دیکھتا ہے اور بے تحاشا بھاگ کر ماسٹر صاحب کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ نہال کے پیچھے باقی تینوں طالب علم بھی تیزی سے ماسٹر صاحب کے برابر پہنچ جاتے ہیں۔ سب کے پیچھے گوکل ہوتا ہے۔

جب سب چلے جاتے ہیں تو مہاراج بجرنگ بجرنگ بجرنگ کا جاپ کرتے ہوئے اندر آتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ طالب علموں کی نگاہ بار بار رسوئی کی طرف جاتی ہے۔ مہاراج سارے مکان پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ پھر رسوئی کی طرف غور سے دیکھنے لگتے ہیں]

مہاراج - پہچانا ہیں نے ـــ ہوں ـــ ہوں ـــ بڑا پاپی بھوت ہے ـــ
بجانے کتنے گھر اجاڑ گیا ہے۔

گوکل - یہاں رہتا ہے نا ؟ کیوں مہاراج ؟

مہاراج - ہاں بیٹا رہتا ہے (رسوئی کی طرف اشارہ کر کے) وہاں رہتا ہے۔

گوکل - دیکھئے ماسٹر صاحب ہم جو کہتے تھے۔

ماسٹر صاحب - اسی لئے تو مہاراج کو بلا کر لائے ہیں۔

نہال - آپ تو کہتے تھے ماسٹر صاحب کہ بھوت کوئی چیز نہیں۔

ماسٹر صاحب - مہاراج بڑی دیا ہوگی جو اس کو بھگا دیجئے گا (لڑکوں کی طرف اشارہ کر کے)
یہ سب ودیارتھی ہیں بچارے۔ اپنے اپنے گاؤں سے مڈل کا امتحان دینے یہاں آئے
ہیں۔ کل پہلا پرچہ ہے۔ اب اگر ـــ وہ نہ بھاگا تو یہ بچارے کیا کریں گے۔

گوکل (ہاتھ جوڑ کر) مہاراج، ہم سب بہت غریب ہیں میرے پتاجی نے قرض ادھار کر کے
مجھے امتحان دینے بھیجا ہے۔ ہم امتحان نہ دے سکے تو مر جائیں گے۔

مہاراج - گھبراؤ نہیں بیٹو، گھبراؤ نہیں (رسوئی کی طرف منہ کر کے) بجرنگ بجرنگ بجرنگ۔
ابھی تک اس دشٹ نے اس گھر میں کوئی جان تو نہیں لی۔

گوکل - جان لی ہے مہاراج۔ محلے والے بتلاتے ہیں کہ ہم سے پہلے جو کرائے دار تھے۔ ان کے
سال بھر کے بچے نے (رسوئی کی طرف اشارہ کر کے) وہاں پیشاب کر دیا تھا۔ بس اسی
رات کو وہاں (رسوئی کی طرف اشارہ کر کے) سے ایک بڑا سا ہاتھ نکلا اور آنگن میں
آ کر اس لڑکے کو اٹھا کر پٹک دیا۔

مہاراج - ہاں وہ تو میں پہچان گیا تھا۔ یہی بڑے بڑے ہاتھ والا قصہ تم لوگوں نے بہت

سنا ہوگا۔ یہ پاپی سب جگہ جاتا ہے اور ایسی ہی حرکتیں کرتا ہے۔ برہم راکس ہے یہ۔ اس سے بچکر رہنا چاہیئے۔

گوکل۔ یہی کرتے ہیں ہم لوگ مہاراج۔ جب باہر جانا ہوتا ہے تو (صدر دروازے کی طرف اشارہ کرکے) ادھر سے ہی جاتے ہیں۔ وُہ پاس ہی رہتا ہے نا۔ ہم لوگ اس (سیڑھی کی طرف اشارہ کرکے) سے چڑھ کر چھت پر جاتے ہیں اور پھر ادھر دوسری سیڑھی لگی ہے اس سے اُتر جاتے ہیں۔

ماسٹر۔ یہ سیڑھی ویڑھی ان لوگوں کے لئے لگانا پڑی۔

رگھو۔ ہماری تھالیاں سب وہیں (رسوئی کی طرف اشارہ کرکے) پڑی رہ گئیں ہم سب پتروں میں بھوجن کرتے ہیں، کیا کریں؟

مہاراج۔ اچھا، اچھا ڈرو نہیں بچو۔ ابھی بھاگا جاتا ہے وہ۔

ماسٹر۔ کیا کھڑے باتیں بنا رہے ہو۔ جاؤ گوکل لالٹین جلاکر لاؤ۔ بہادر! جاؤ بازار سے لپک کر دو بیڑے پان کے توڑے آؤ اور دیکھو ایک آدھ سیر دودھ بھی مہاراج کیلئے۔

مہاراج۔ دودھ کیا ہوگا بیٹا —— بجرنگ بجرنگ بجرنگ۔ اچھا لے آ پی لوں گا —— (بہادر سیڑھی کی طرف بڑھتا ہے) بجرنگ بجرنگ بجرنگ، سن تو (بہادر لوٹ پڑتا ہے)، بجرنگ بجرنگ بجرنگ۔ ذرا سا ایک پاؤ بھر پیڑا بھی لیتا آ (بہادر سیڑھی کی طرف بڑھتا ہے) زیادہ نہیں۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ۔ سُن تو (بہادر واپس آتا ہے) بجرنگ بجرنگ بجرنگ۔ پیڑا اچھا نہ ہو تو برفی (بہادر سیڑھی کی طرف بڑھتا ہے)، بجرنگ بجرنگ بجرنگ، سن تو —— دونوں —— پاؤ بھر —— جلدی آنا۔ بجرنگ بجرنگ۔

ماسٹر۔ دروازے سے کیوں نہیں جاتے ہو۔ مہاراج بیٹھے ہیں تو کیا ڈر ہے۔

مہاراج ۔ بجرنگ، بجرنگ، بجرنگ ......

[مہاراج بہادر کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر صدر دروازے کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔
بہادر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جاتا ہے۔ پھر دوڑ کر دروازے کے باہر نکل
جاتا ہے]

ماسٹر ۔ رگھو، مہاراج کے لئے آسن لاؤ (رگھو اندر کمرے میں جاتا ہے) نہال ۔ دیکھو، یہاں
کتنا کوڑا پڑا ہے۔ جب تک تم لوگوں کو بتاؤں نہیں، کام تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔
جاؤ جھاڑو لا کر اسے صاف کرو۔

(نہال اندر کمرے میں چلا جاتا ہے)

ماسٹر ۔ مہاراج ۔ میں بڑا غریب آدمی ہوں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ مجھ پر دیا کیجئے۔ یہ لڑکے
امتحان میں نہ بیٹھے تو میری نوکری جاتی رہے گی۔ ان کو سمجھا دیجئے کہ یہاں بھوت ووت
کچھ نہیں ہے۔ بلیاں لڑا کرتی ہیں۔ دکشنا جو کہئے ......

مہاراج ۔ گھبراؤ نہیں بچہ۔ گھبراؤ نہیں۔ ابھی برہم راکشس بھاگا جاتا ہے۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ
(نہال جھاڑو لا کر زمین جھاڑتا ہے۔ گوکل لالٹین لے کر آتا ہے۔ رگھو آسن لا کر بچھا دیتا
ہے۔ مہاراج بجرنگ کی جاپ کرتے رہتے ہیں)

ماسٹر ۔ پدھاریئے مہاراج۔

(مہاراج بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک ہاتھ سے چمٹا بجا بجا کر بجرنگ بجرنگ بجرنگ کی جاپ
کرتے جاتے ہیں۔ دوسرے ہاتھ سے تھیلے کے اندر سے ایک ایک کر کے سات کٹوریاں
سات چھوٹی چھوٹی تھالیاں ...... نکالتے ہیں۔ قرینے سے سجاتے ہیں پھر
بہت سی پڑیاں نکال کر ان کا سامان کٹوریوں اور پیالوں میں رکھتے ہیں۔ اس اثناء

(ہر سب لوگوں سے کام بیٹنے جانتے ہیں)

مہاراج (گوکل سے) بیٹا ذرا سے کوئلے تو لانا۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ۔۔۔۔

گوکل۔ اچھا مہاراج

(گوکل رسوئی کی طرف بڑھتا ہے۔ ٹھٹھکتا ہے۔ پھر کچھ سوچکر پلٹتا ہے اور دوڑ کر صدر دروازے سے نکل جاتا ہے)

مہاراج (نہال سے) بیٹا ذرا دیا سلائی تو لانا۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ۔۔۔

نہال۔ اچھا مہاراج

(نہال اکدرے میں جاتا ہے)

مہاراج (رگھو سے) بیٹا ذرا سا چیتھڑا تو لانا۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ۔۔۔۔۔

رگھو۔ اچھا مہاراج۔

(رگھو اکدرے میں جاتا ہے)

مہاراج (ماسٹر سے) بیٹا تو کوئی برتن تو لانا آگ بنانے کو۔ بجرنگ، بجرنگ بجرنگ۔۔۔۔

ماسٹر۔ اچھا مہاراج

(ماسٹر اکدرے میں جاتے ہیں۔ نہال دیا سلائی لے کر آتا ہے)

نہال۔ یہ لیجئے مہاراج

مہاراج سدھر رہے بچہ۔ ذرا سی روئی تو لانا۔ بجرنگ۔ بجرنگ بجرنگ۔۔۔

نہال۔ اچھا مہاراج

(نہال جاتا ہے۔ رگھو چیتھڑا لے کر آتا ہے)

رگھو۔ یہ لیجئے مہاراج۔

مہاراج ۔ دھرتے بچہ ۔ اب ذرا سا گڑ وا تیل تو لانا ۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ . . . .

رگھو ۔ اچھا مہاراج

(رگھو جاتا ہے ۔ ماسٹر مٹی کا ایک برتن لیکر آتے ہیں)

مہاراج ۔ دھرتے بچہ ۔ ابھی گوکل کوئلہ نہیں لایا ۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ . . . . .

ماسٹر (پکارتا ہے) گوکل گوکل ، نجانے کہاں گئے ۔ آتے ہوں گے ۔

(نہال روئی لے کر آتا ہے)

نہال ۔ یہ لیجئے مہاراج ۔

مہاراج ۔ اچھا بیٹا ۔ اب اسکی دو بڑی بڑی بتیاں تو بنا ۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ . . . . .

(نہال بتیاں بنانے لگتا ہے ۔ گوکل دروازے سے دوڑتا ہوا آتا ہے)

گوکل (ہانپتا ہوا) یہ کوئلے ۔ مہاراج

ماسٹر ۔ اتنی دیر کہاں لگائی تھی ؟

گوکل ۔ کوئلے وہاں (رسوئی کی طرف اشارہ کر کے) تھے ۔ اس لئے بازار سے لایا ہوں دوڑتا ہوا گیا اور دوڑتا ہوا آیا ۔

مہاراج ۔ شاباش بیٹا ۔ بیٹھ جا ، سستا لے (ماسٹر سے) لے بیٹا یہ کوئلے لے اور یہ دیا سلائی اور یہ چھیچھڑا ۔ اس برتن (مٹی کے برتن کی طرف اشارہ کر کے) میں آگ تو بنا ۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ . . . . .

ماسٹر ۔ اچھا مہاراج ۔

(ماسٹر آگ بنانے لگتے ہیں ۔ مہاراج تھیلے کے اندر سے ایک چراغدان نکالتے ہیں)

مہاراج (نہال سے) لے بیٹا یہ چراغدان لے۔ یہ لٹھ دا تیل ہے۔ چوکھہ چراغ تو جلا
گوکل (نہال سے) ہاں تم سے نہ بنیں تو مجھے دیدو
نہال۔ لو۔

(گوکل نہال سے روئی لے کر بتیاں بنانے لگتا ہے مہاراج جھولے کے اندر سے ایک مورت نکالتے ہیں۔ گوکل بتیاں بنا کر چراغ جلا دیتا ہے)

گوکل۔ لائیے ماسٹر صاحب میں آگ سلگا دوں۔

(ماسٹر صاحب گوکل کی طرف آگ کا برتن بڑھا دیتے ہیں۔ بہادر سیڑھی پر سے دودھ کا آبخورہ اور مٹھائی کا دونا لے کر اترتا ہے۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ مہاراج ایک نظر ڈال کر اپنا سامان درست کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ گوکل آگ پھونک رہا ہے۔ وہ نظر نہیں اٹھاتا۔ بہادر تین ڈنڈے اترتا ہے کہ دودھ چھلک جاتا ہے۔ ماسٹر صاحب لپک کر سیڑھی کے برابر پہنچ جاتے ہیں)

ماسٹر۔ لاؤ۔ دونوں چیزیں مجھے دیدو۔

(بہادر اوپر سے دونوں چیزیں ماسٹر صاحب کو پکڑا دیتا ہے)

ماسٹر۔ دروازے سے کیوں نہیں آئے۔ ڈرپوک بہادر ——— مہاراج یہ چیزیں لے آؤں

مہاراج۔ ابھی الگ دھر دے بیٹا۔

(ماسٹر صاحب آبخورہ اور دونا ایک کونے میں رکھدیتے ہیں۔ مہاراج کے ایک طرف گوکل، رگھو اور نہال بیٹھے ہیں۔ ماسٹر صاحب اور بہادر آگر دوسری

دوسری طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ مہاراج کے سامنے سب سامان سجا ہے مہاراج نے مورت کے سامنے پراغدان رکھدیا ہے۔ آگ سلگا کر گوکل برتن مہاراج کی طرف بڑھا دیتا ہے)

گوکل۔ مہاراج آگ بن گئی

(مہاراج آگ میں گوگل ڈالتے ہیں۔ بہت سا دھواں اٹھتا ہے۔ پھر اونچی آواز میں جاپ کرتے ہیں)

مہاراج۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ   بجرنگ بجرنگ بجرنگ
بجرنگ بجرنگ بجرنگ   بجرنگ بجرنگ بجرنگ

(ماسٹر سے) لو بیٹیا (ایک کٹوری بڑھا کر) اس میں سیندور ہے۔ اپنی انگلی سے اسکا ٹیکا (مورتی کی طرف اشارہ کرکے) اس کے ماتھے پر لگا دو۔ بجرنگ بجرنگ بجرنگ

(ماسٹر ٹیکا لگا دیتے ہیں)

مہاراج۔ سنو بچو۔ ایک منگل کی رات کو میں جنگل میں گھوم رہا تھا۔ گھومتے گھومتے مرگھٹ کی طرف جا نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک پیپل کے نیچے الاؤ جل رہا ہے۔ چاروں طرف اگیا بتیاں۔ برم براکس اور سب چھوٹے بڑے بھوت جمع ہیں۔ دنگل ہو رہا ہے۔ سامنے ایک کمبل پر ایک سادھو مہاتما، انگ بھبھوت ملے، دھونی رمائے براجمان ہیں۔ کشتی میں جو جیتتا ہے اس کو اپنے جھنبل سے نکال کر پرشاد دیتے ہیں۔ میں نے جھٹ آگے بڑھ کر ان کے پاؤں چھوئے۔ انہوں نے پوچھا "تو کون؟" میں نے کہا "آپ کا ایک داس"۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ مہاراج کچھ ہم کو بھی دیجیے۔ بولے، اچھا لے یہ منتر لے جب تو اس کی جاپ کرے گا تو بھوت پریت، چڑیل بھتنی کلوا پر لونا چماری شیخ سدو زین خان

برہم راکس اور ناگیا بتیاں جو کوئی بھی ہو گا جل کر بھسم ہو جائے گا۔" وہ منتر یہ ہے (چمٹا بجا بجا کر)

منگل جنگل کمبل مرگھٹ ڈنگل چنبل
منگل جنگل کمبل مرگھٹ ڈنگل چنبل

سب کہو

مہاراج اور سب لوگ ایک ساتھ۔ (مہاراج چمٹا بجاتے جاتے ہیں)

منگل جنگل کمبل مرگھٹ ڈنگل چنبل
منگل جنگل کمبل مرگھٹ ڈنگل چنبل
منگل جنگل کمبل مرگھٹ ڈنگل چنبل
منگل جنگل کمبل مرگھٹ ڈنگل چنبل
منگل جنگل کمبل مرگھٹ ڈنگل چنبل
منگل جنگل کمبل مرگھٹ ڈنگل چنبل
منگل جنگل کمبل مرگھٹ ڈنگل چنبل

(مہاراج جھولے سے ایک بڑی سی کیل نکالتے ہیں۔ اس پر "چھو" کر کے ماسٹر صاحب کو دیتے ہیں)

مہاراج۔ لو بیٹا۔ ٹھیک اس جگہ جہاں اس پاپی کا استھان ہے، اسے ٹھونک دو۔

ماسٹر۔ کس سمے مہاراج؟

مہاراج۔ جس سمے وہ نکلا کرتا ہے؟

(ماسٹر صاحب بنڈی کی جیب سے بڑی سی گھڑی نکال کر وقت دیکھتے ہیں)

ماسٹر۔ اے گوکل، جلدی سے یہ کیل ٹھونک تو آ۔

مہاراج (چوکنا ہو کر) ابھی کیوں؟

ماسٹر۔ کل وہ کوئی دس بجے نکلا ہوگا۔ کیوں گوکل؟

گوکل۔ ہاں ماسٹر صاحب۔

مہاراج (گھبرا کر) کیا وہ کل نکلا تھا؟

سب طالب علم (ایک ساتھ) ہاں مہاراج

گوکل۔ بڑی ڈراؤنی ڈراؤنی آوازیں وہاں (رسوئی کی طرف اشارہ کر کے) سے نکال کر ہم سب کو گھر سے بھگا دیا۔ پھر رات بھر ہم لوگ سڑکوں پر گھومتے رہے مہاراج بڑا کشٹ اٹھایا۔

ماسٹر۔ بلیاں ولیاں تھیں مہاراج۔

مہاراج (بہت گھبرا کر) اب کیا بجا ہے؟

ماسٹر۔ دس بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔

مہاراج۔ ارررر بڑی دیر ہو گئی۔ بڑی دیر ہو گئی۔

(مہاراج اٹھ کر جلدی جلدی کٹوریوں اور تھالیوں کا سامان کاغذوں میں خالی کر کے۔ پڑیاں اور تھالی سب سامان تھیلے میں بھرنے لگتے ہیں۔ مہاراج کی گھبراہٹ دیکھ کر سب ہکا بکا ہو جاتے ہیں)

گوکل (ہاتھ جوڑ کر) مہاراج ابھی نہ جائیے۔ یہ سمے نکل جائے۔

ماسٹر۔ اے مہاراج دیا کیجئے ان ودیارتھیوں پر۔

مہاراج۔ کیل تو دے دی

رگھو
بہادر } (ایک ساتھ) { ابھی ٹھہر جائیے
نہال   ابھی نہ جائیے
                      اس سمے نہ جائیے

مہاراج - تم لوگ بڑے کھراب ہو۔ سادھو مہاتماؤں کا سمے کھراب کرتے ہو

گوکل
رگھو } ایک ساتھ { شما کیجئے مہاراج

بہادر
نہال } ایک ساتھ { مہاراج شما کیجئے

مہاراج - نہیں، نہیں، نہیں، نہیں تم سب بہت کھراب ہو۔

(مہاراج جلدی جلدی سب سامان تھیلے میں رکھنے کے بعد گھبراہٹ میں چراغدان بلا بجھاتے ہوئے تھیلے میں رکھنا چاہتے ہیں مگر بتیاں اور تیل زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اس طرح تھیلا جلنے سے بچ جاتا ہے۔ پھر مہاراج اسی گھبراہٹ میں مٹی کا برتن جس میں آگ بھری ہے تھیلے میں رکھنا چاہتے ہیں مگر برتن بہت گرم ہے۔ ہاتھ جل جاتا ہے اور وہ چھوٹ کر گر پڑتا ہے۔ برتن ٹوٹ جاتا ہے آگ بکھر جاتی ہے۔ مہاراج جلی انگلیوں کو پھونکنے لگتے ہیں آگ کے بکھرنے سے سب کود کود کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں)

ماسٹر (ایک بات یاد کر کے) مہاراج کچھ جل پان تو کر لیجئے۔ دکشنا تو لے لیجئے۔

مہاراج (انگلیاں پھونکتے ہوئے غصے سے) تم لوگ بڑے کھراب ہو۔ بڑے کھراب ہو سراپ دوں گا جل کر بھسم ہو جاؤ گے

[مہاراج ٹھیلا اور چمٹا لے کر کھڑاؤں پہنکر صدر دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ مگر ذرا ہی دور جاکر اک دم پلٹ پڑتے ہیں اور کھڑاؤں اتار کر سیڑھی پر چڑھنے لگتے ہیں، پہلے ڈنڈے پر پاؤں پھسل جاتا ہے۔ پھر سنبھل کر چڑھنے لگتے ہیں گوکل دوڑ کر کھڑاؤں اٹھا کر مہاراج کی طرف اونچا کرتا ہے)

گوکل۔ مہاراج، مہاراج، مہاراج، مہاراج

(مہاراج گوکل کی آواز سن کر اور تیزی سے چڑھنے لگتے ہیں۔ گوکل کھڑاؤں لیکر مہاراج کے پیچھے چڑھتا ہے۔ گوکل جب تک آدھی دور پہنچے۔ مہاراج اوپر پہنچ جاتے ہیں۔ پھر بڑے دھماکے سے دوسری طرف کود پڑتے ہیں)

گوکل۔ ماسٹر صاحب، مہاراج تو کود کر بھاگ گئے

ماسٹر صاحب۔ کھڑاؤں اٹھا کر رکھ لو۔ وہ کل آکر لے جائیں گے۔

(اسٹیج کی روشنی دھیمی ہو جاتی ہے۔ گوکل نیچے اتر رہا ہے۔ سب رسوئی کی طرف تاک رہے ہیں۔ خاموشی۔ گوکل نیچے آکر کھڑاؤں رکھ دیتا ہے)

رگھو۔ مہاراج اس طرح کیوں بھاگے ماسٹر صاحب؟

ماسٹر صاحب۔ دھیان گیان کا سمے ہو گیا تھا

گوکل۔ ایسے ہی دھیان گیان والے ہوتے تو لڈو پیڑے منگواتے؟

(خاموشی۔ اسٹیج کی روشنی اور دھیمی ہو جاتی ہے)

نہال۔ ماسٹر صاحب ڈر لگ رہا ہے۔

ماسٹر صاحب۔ ڈر کی کون سی بات ہے نہال۔ منتر کی جاپ تو ہو چکی، بیٹا میں تم سے کہتا ہوں کہ بھوت ووت کوئی چیز نہیں ہے یہ سب جھوٹ موٹ کی باتیں ہیں

(رسوئی میں کچھ کھڑ کھڑ ہوتا ہے)

نہال (چونکر) وہ آپہنچا ماسٹر صاحب

(نہال ماسٹر صاحب سے لپٹ جاتا ہے۔ گوکل۔ رگھو اور بہادر اکڑے اور بجلی روشنی کے درمیان کی دیوار سے لگ جاتے ہیں۔ ماسٹر صاحب بھی ایک قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ سب رسوئی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ خاموشی)

ماسٹر۔ وہی ہیں بلیاں جو کل تھیں۔ ڈرو نہیں، گوکل، رگھو، بہادر، نہال

رگھو۔ ماسٹر صاحب بھوت بلی کے روپ میں بھی آتے ہیں۔

بہادر۔ ہاں ماسٹر صاحب

(خاموشی)

نہال۔ ماسٹر صاحب، وہ کیل؟

ماسٹر صاحب۔ ہاں رکھی ہے

نہال۔ پھر وہ ٹھونک دیجئے۔

ماسٹر صاحب۔ منتر کی جاپ ہو چکی۔ اس سے وہ جل کر بھسم بھی ہو گیا ہو گا، بیٹا تم نے سنا نہیں۔ سادھو مہاتما نے مہاراج سے کیا کہا تھا۔

نہال۔ مہاراج تو کہہ گئے ہیں کہ کیل ٹھونک دینا۔

ماسٹر صاحب۔ تو ٹھونک دی جائے گی۔

بہادر۔ سبھے تو آگیا ہے۔

ماسٹر۔ تو لو بہادر ٹھونک آؤ (ماسٹر صاحب بہادر کی طرف کیل بڑھاتے ہیں۔

وہ نہیں لیتا۔ پھر ماسٹر صاحب گوکل کی طرف بڑھتے ہیں) تو گوکل (گوکل کیل لے لیتا ہے مگر کچھ جواب نہیں دیتا) ہیں تو ان باتوں کو مانتا وانتا نہیں

بہادر
نہال } ایک ساتھ { پھر جاؤ گوکل

گوکل۔ تم ہی نہ چلے جاؤ۔

ماسٹر صاحب (ڈانٹ کر) جاتا کیوں نہیں ہے

گوکل۔ کہاں ٹھونکوں گا ماسٹر صاحب؟

ماسٹر صاحب (رسوئی کی طرف اشارہ کرکے) رسوئی کے اندر، اس کونے میں۔

گوکل (اسی جگہ کھڑے کھڑے) کہاں ماسٹر صاحب؟

ماسٹر صاحب۔ ارے وہ۔ اس جگہ —— وہاں

گوکل۔ آپ چل کر بتا دیجیے

ماسٹر صاحب۔ تم تو جانتے ہو رگھو۔

رگھو۔ جی ہاں مگر آپ بھی ساتھ چلیئے۔

ماسٹر صاحب (حیرت سے) میں چلوں! ہیں!

نہال اور بہادر۔ ہاں ماسٹر صاحب

رگھو اور گوکل۔ ہاں ماسٹر صاحب

ماسٹر صاحب۔ میں کوئی بھوت ووت کو مانتا ہوں جو چلوں؟ (چاروں کی طرف دیکھکر) اچھا تم لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ سب کے سب چلیں —— تو چلو۔

(کوئی آگے نہیں بڑھتا ہے)

گوکل۔ پھر چلئے ماسٹر صاحب

ماسٹر صاحب۔ میں تو چلنے کو تیار ہوں۔ تم ہی لوگ ڈر رہے ہو ـــــ

(کوئی آگے نہیں بڑھتا)

نہال (ماسٹر صاحب کو ذرا آگے دھکیل کر) چلئے ماسٹر صاحب

ماسٹر صاحب (نہال کو ڈانٹتے ہیں) دھکیلتا ہے بدتمیز۔ چل تیری سزا ہے کہ آگے چل (نہال کو پکڑ کر آگے کرنا چاہتے ہیں) چل

نہال (ڈر کر) نہیں نہیں ماسٹر صاحب، نہیں نہیں۔

گوکل۔ آگے آپ ہی چلئے ماسٹر صاحب

ماسٹر صاحب۔ میں ڈرتا ہوں کچھ ـــــ لو

(ماسٹر صاحب جوش میں آ کر دور تک چلے جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے گوکل رگھو، بہادر اور نہال اسی ترتیب سے قطار بنائے ہوئے ہیں۔ ماسٹر صاحب اکدم سے رک جاتے ہیں)

ماسٹر صاحب۔ منگل جنگل کمبل مرگھٹ ونگل پنبل چھو چھو

(ماسٹر صاحب منتر اپنے دونوں شانوں پر پھونک کر ایک قدم آگے بڑھ جاتے ہیں)

گوکل۔ اور آگے ماسٹر صاحب

ماسٹر صاحب۔ منگل جنگل کمبل مرگھٹ ونگل چنبل چھو چھو

(ماسٹر صاحب ایک قدم اور آگے بڑھ جاتے ہیں)

گوکل۔ ابھی اور ماسٹر صاحب

ماسٹر صاحب۔ مغگل جنگل کمبل مرگھٹ ونگل جانبل چھو چھو۔

(ماسٹر صاحب اپنے دونوں شانوں پر منتر دم کر کے ایک اور قدم آگے بڑھتے ہیں۔ رسوئی کے دروازے کے پاس پہنچ جاتے ہیں)

ماسٹر صاحب۔ ارے یہی جگہ ہے نا؟

گوکل۔ نہیں اور آگے۔

رگھو۔ رسوئی کے اندر، وہ۔

ماسٹر صاحب (بگڑ کر) آگے آ کر کیوں نہیں بتاتا ہے؟

(رگھو کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔ ماسٹر صاحب اسی جگہ رسوئی کے دروازے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں)

ماسٹر صاحب۔ ارے ٹھونکوں کاہے سے؟ اپنے سر سے؟

رگھو۔ رسوئی کے اندر سل بٹا رکھا ہے

ماسٹر صاحب۔ تو آ کر اٹھا دے۔ دور سے کھڑا باتیں بنا رہا ہے۔

(رگھو کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔ گوکل لپک کر دہاراج کی ایک کھڑاؤں اٹھا لاتا ہے)

گوکل۔ لیجئے، اس سے ٹھونک دیجئے

(ماسٹر کھڑاؤں لے کر کیل ٹھونکتے ہیں)

ماسٹر (اطمینان کی سانس لے کر) اب تو بھسم ہو گیا۔ پاپی، ڈُشٹ۔

بہا ور اور نہال۔ ٹھونک دی کیل؟

گوکل اور رگھو۔ ٹھونک دی کیل؟

(سب طالب علم اور قریب آجاتے ہیں۔ ماسٹر آخری ضرب لگا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

ماسٹر صاحب۔ وہ مارا۔ چلو

(ماسٹر صاحب کھڑے ہوتے ہیں اور واپس جانا چاہتے ہیں۔ لڑکے اطمینان محسوس کرتے ہیں)

نہال۔ بھسم ہو گیا

بہادر۔ سزا ہے اسکی۔

ماسٹر صاحب۔ چلو چلو، اب پڑھو چل کر۔ کل امتحان ہے۔

(ماسٹر کی دھوتی کیل سے پھنس گئی ہے، جیسے ہی وہ اور لڑکے رسوئی کی طرف پیٹھ کر کے واپس جانا چاہتے ہیں۔ ماسٹر کے منہ سے بھیانک چیخ نکل جاتی ہے۔ چیخ کے ساتھ ہی ماسٹر گوکل کا پچھلا دامن، گوکل رگھو کا، رگھو بہادر کا اور بہادر نہال کا پچھلا دامن پکڑ لیتے ہیں۔ ہر ایک بھاگنا چاہتا ہے۔ مگر بھاگ نہیں سکتا ہے۔ کوئی گھوم کر پیچھے نہیں دیکھتا ہے)

چاروں طالب علم۔ کیا ہوا، کیا ہوا، کیا ہوا؟

ماسٹر صاحب (ڈری ہوئی بھیانک آواز سے) ارے دھوت نے بھوتی پکڑ لی۔

گوکل، رگھو، بہادر، نہال } ایک ساتھ { ہائے رام، ہائے رام، ہائے رام
مر گئے، مر گئے، مر گئے، مر گئے
ہائے اب کیا ہو گا۔ امتحان کیسے دیں گے۔
(گھگھی بندھ جاتی ہے) ما، ما، ما، ما، ما، ما،

ماسٹر صاحب (ڈری ہوئی بھیانک آواز سے چلا کر) ارے منتر کا جاپ کرو۔

گوکل۔ ہاں منتر کا جاپ کرو۔

رگھو۔ ہاں منتر کا جاپ کرو۔

بہادر۔ منتر کا جاپ کرو۔

نہال۔ ماماماماماماما

ماسٹر صاحب۔ ارے جلدی کوئی جاپ کرو۔ وہ میری کمر توڑے ڈال رہا ہے منتر کیا تھا۔ کمبخت یاد ہی نہیں آتا ہے۔

گوکل۔ منگل، بدھ، اتوار، سوموار۔

ماسٹر
گوکل
رگھو
بہادر
نہال
} ایک ساتھ {

منگل پیپل ولدل منگل پیپل ولدل منگل پیپل....
منگل بدھ اتوار سوموار، منگل بدھ اتوار سوموار، منگل....
مرگھٹ مرگھٹ مرگھٹ مرگھٹ مرگھٹ مرگھٹ
منگل کمبل چنبل، منگل کمبل چنبل، منگل کمبل پیپل
ماماماماماماماما

(چاروں طالب علم زور جو لگاتے ہیں تو گوکل کا پچھلا دامن پھٹ جاتا ہے ماسٹر کے ہاتھ میں پھٹا دامن رہ جاتا ہے۔ وہ اسی طرح پکڑے رہتے ہیں چاروں طالب علم جھونک میں تلے اوپر گر پڑتے ہیں۔ پھر فوراً ہی اٹھتے ہیں اور سیڑھی کی طرف بھاگتے ہیں)

چاروں طالب علم۔ بھاگو بھاگو بھاگو بھاگو....

(چاروں طالب علم اک ساتھ سیڑھی پر چڑھنا چاہتے ہیں۔ گوکل آگے ہے۔

کشمکش جو ہوتی ہے تو وہ گر پڑتا ہے مگر کوئی اسے اٹھاتا نہیں ہے سب بدحواس سے سیڑھی پر پھسلتے سنبھلتے چڑھتے جاتے ہیں۔ گوکل اٹھتا ہے)

ماسٹر صاحب۔ ہائے مجھے کس پر چھوڑے جا رہے ہو ——— ارے میرے بیٹو—— بیٹا گوکل، بیٹا رگھو، بیٹا بہادر، بیٹا نہال

گوکل۔ ماسٹر صاحب تم بھی بھاگ آؤ۔

ماسٹر۔ ارے وہ مجھے چھوڑے تو۔ ارے مہاراج برم راکس دیا کرو، میں غریب آدمی ہوں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کا میرے بعد کیا ہو گا۔

(ماسٹر رونے لگتے ہیں۔ رگھو، بہادر، نہال چھت پر پہنچ جاتے ہیں اور دھم دھم دوسری طرف کود جاتے ہیں۔ گوکل بھی لنگڑاتا ہوا کئی ڈنڈے چڑھ جاتا ہے)

گوکل۔ ماسٹر صاحب زور لگاؤ، زور لگانے سے مہاراج برم راکس چھوڑ دیتے ہیں۔

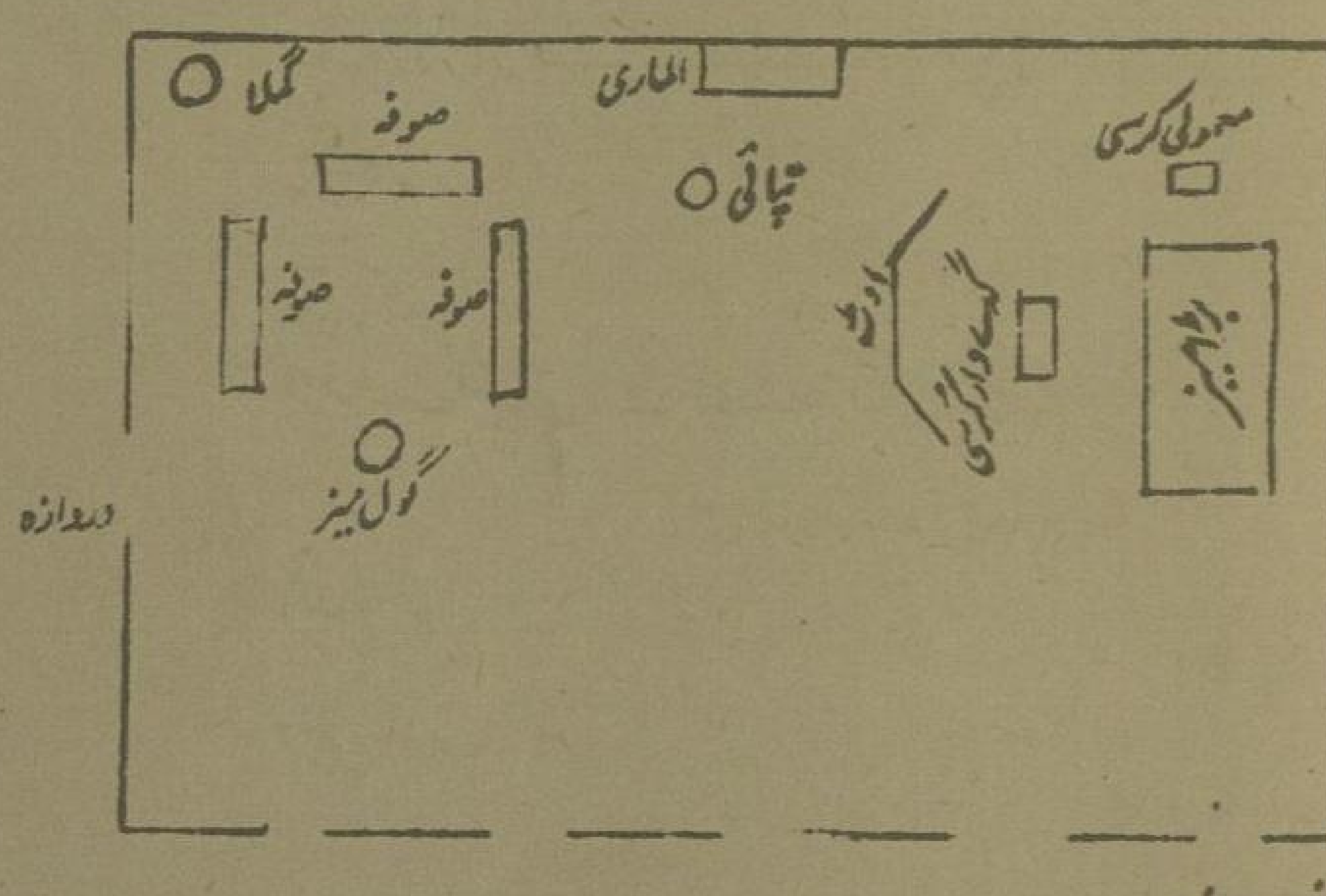
ماسٹر (زور لگاتا ہے) ارے مہاراج برم راکس چھوڑ دو۔

(ماسٹر جان توڑ کر جو زور لگاتے ہیں تو دھوتی کھل جاتی ہے۔ وہ بدحواس سیڑھی کی طرف بھاگتے ہیں۔ گوکل اوپر پہنچ جاتا ہے۔ ماسٹر تین چار ڈنڈے چڑھ جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

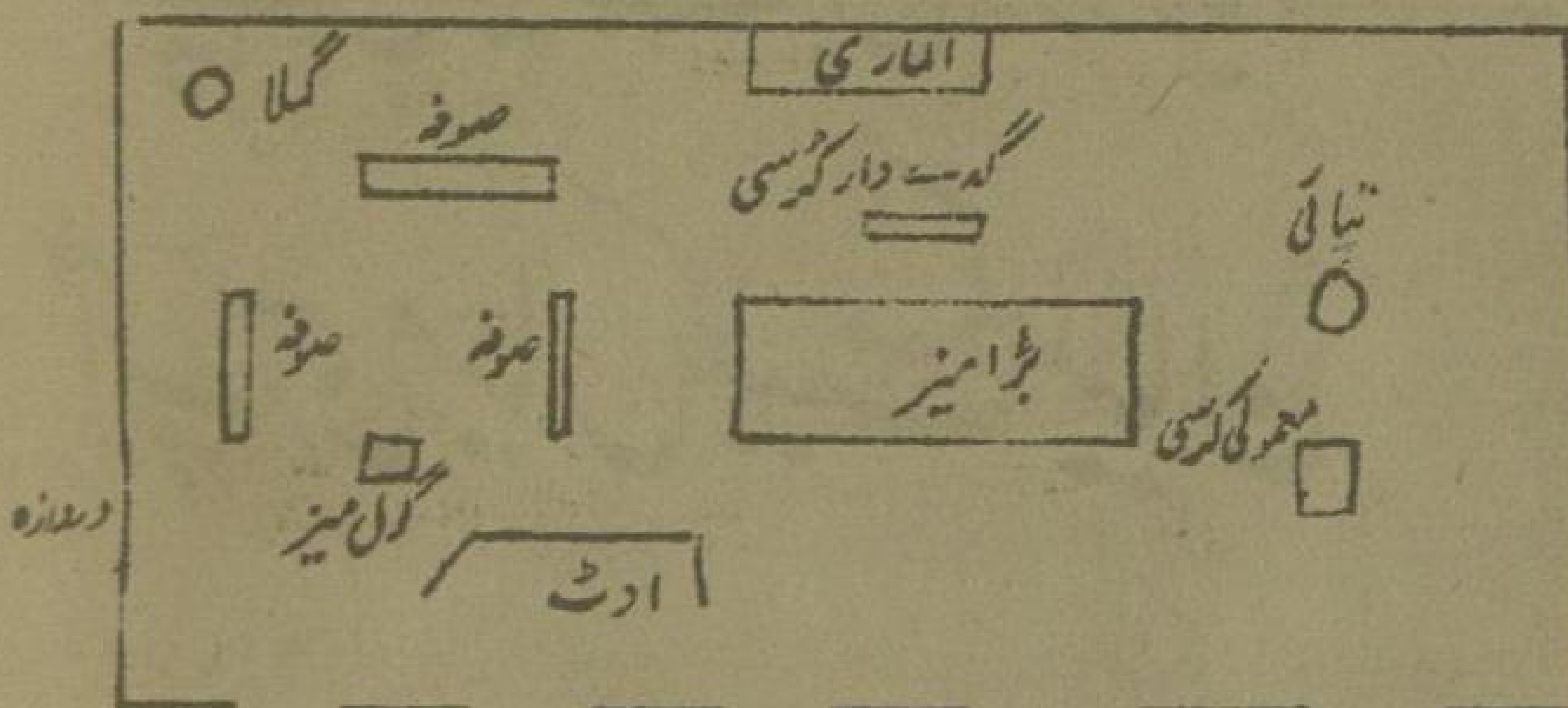
ڈراپ

آپ ہی میاں در دربار
آپ ہی میاں کھیت کھلیان

اسٹیج نمبر ا



اسٹیج نمبر ۲



کردار

مسٹر وروربار ——— جج

پیشکار

چپراسی

ملزم جمیعت کھلیان ——— ایک ملزم جو بغاوت کے الزام
میں گرفتار ہوا ہے (غیر حاضر)

وکیل سرکار ——— (غیر حاضر)

وکیل ملزم ——— (غیر حاضر)

زمانہ موجودہ

منظر:-

(اسٹیج مسٹر دربار کا ڈرائینگ روم ہے۔ بائیں طرف صوفہ سٹ ہے۔ بیچ میں ایک بڑا صوفہ اور ادھر اُدھر دو چھوٹے صوفے۔ اس کے بیچ میں گول میز۔ داہنی طرف بڑے صوفے کے پاس ایک تپائی راکھ دانی وغیرہ رکھنے والی۔ داہنی دیوار سے لگا ہوا ایک بڑا میز ہے۔ اس کی طرف رُخ کئے ہوئے ایک اونچی پیٹھ کی گدے دار کرسی ہے۔ میز کی آڑ میں یعنی سامنے کی دیوار کی طرف ایک معمولی کرسی ہے صوفوں اور میز کرسیوں کو جُدا کرنے کے لئے ۵ فٹ اونچی اوٹ کھڑی ہے۔ اس کے دو پٹ ہیں جو زاویہ منفرجہ پر، کرسیوں کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اوٹ اور صوفے کے بیچ میں، سامنے کی دیوار سے لگی، ایک الماری رکھی ہے۔ اسٹیج کی بائیں دیوار میں ایک دروازہ ہے۔ جس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ بائیں کونے میں ایک گملا رکھا ہے۔ جس میں کھجور کا پودا ہے۔ سامنے کی دیوار پر ایک تصویر لگی ہے کوئی سینری ہے مگر صاف سمجھ میں نہیں آتی ہے

الماری پر یہ سامان رکھا ہے (۱) جج کا دھگ (۲) جج کی سیاہ ٹوپی (۳) لمبے کی کمانی کی ایک عینک (۳) وکیلوں والی ایک نئی گون (۴) وکیلوں والی ایک پرانی پھٹی ہوئی گون (۵) ہتھکڑیاں (۶) چپراسی۔

بڑے میز پر فائیلیں رکھی ہیں اور ایک بہت بڑا قلمدان ہے

بیچ صوفے پر مسٹر دربار نیم دراز، سگار پی رہے ہیں۔

مسٹر دربار، لمبا دبلا بدن، چاند چکنی، آگے جھکی ہوئی ناک اس پر لباس بہت عمدہ سوٹ جس کا رنگ گہرا مگر شوخ نہیں)

(چپراسی اندر آتا ہے۔ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے)

چپراسی۔ حضور

دردربار۔ کیا؟

چپراسی۔ جناب پیشکار صاحب تشریف لاتے ہیں۔

دردربار۔ بھیج دو۔

(چپراسی جاتا ہے۔ پیشکار اندر آتا ہے۔ اوسط قد۔ ہلکا سا توندہ شیروانی گھٹنا اور پگڑی میں ملبوس۔ لوہے کی کمانی کی عینک جو ناک کی نوک پر ٹکی ہے۔ بغل میں فائلوں کا بستہ، جھک کر آداب بجا لاتا ہے)

دردربار۔ ہوں

پیشکار۔ حضور عالی۔ آج ملزم کھیت کھلیان کی اپیل ہے۔

دردربار۔ الزام؟

پیشکار۔ حضورِ عالی سرکار دولت مدار کے خلاف باغیانہ تقریر کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے

دردربار۔ مسل؟

پیشکار۔ یہ، حضورِ عالی۔

دردربار۔ رکھ دو، سوچوں گا۔

(پیشکار بڑھ کر بڑے میز پر مسل رکھ دیتا ہے پھر واپس آتا ہے جھک کر سلام کرتا ہے اور پچھلے قدموں سے کہ مسٹر دردربار کی طرف پیٹھ نہ ہو۔ باہر چلا جاتا ہے۔ ذرا دیر خاموشی)

مسٹر دردربار اٹھتے ہیں اور بہت پھرتی سے بڑے میز کو کھینچ کر بیچ میں

لے آتے ہیں۔ اس کے پیچھے گدے دار کرسی رکھتے ہیں۔ معمولی کرسی میز کے داہنی طرف، اس کے پیچھے تپائی رکھتے ہیں۔ پھر اوٹ اٹھا کر لاتے ہیں۔ اس کو میز کے بائیں کونے سے ذرا ہی دور پر اس طرح کھڑا کرتے ہیں کہ اس کے دونوں پہ زاویۂ قائمہ پر مڑے ہوئے تماشائیوں کی طرف رہتے ہیں۔ میز کے بائیں طرف اوٹ سے اتنا ہٹا ہوا کہ تماشائیوں کو نظر آئے گول میز رکھتے ہیں۔ پھر الماری پر سے سامان لا کر اس طرح رکھتے ہیں۔

جج کی سیاہ ٹوپی بڑے میز پر ہتھکڑیاں، چپراسی اور پٹی کا فن گول میز پر لوہے کی کمانی کی عینک اور نئی گاؤن تپائی پر۔

مسٹر دربار کے پاؤں بہت پھرتی سے اور ہاتھ بہت سبک طرح سے حرکت کرتے ہیں۔ یہ سارا کام وہ چند منٹ میں ختم کر دیتے ہیں۔ ان کی پھرتی میں وقار ہے جب سب کام ختم ہو جاتا ہے تو مسٹر دربار گون پہن کر بہت وقار سے گدے دار کرسی پر بیٹھتے ہیں)

مسٹر دربار (آواز میں رعب ہے اور یہ اعتماد ہے کہ میرا حکم بجا لایا جائیگا) پیشکار، ملزم کھیت کھلیان کو، جو سرکار کے خلاف باغیانہ تقریر کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے، حاضر کرو۔

(مسٹر دربار اسی پھرتی سے ٹوپی اتار کر بڑے میز پر رکھ دیتے ہیں اور لوہے کی کمانی والی عینک لگا کر معمولی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)

مسٹر دربار (اطاعت گذاری کے لہجہ میں) بہتر حضور عالی (منہ پھیر کر) چپراسی ملزم کھیت کھلیان کو حاضر کرو۔

(مسٹر دربار اسی پھرتی سے عینک اتار کر چپراسی گول میز سے اٹھا کر لگاتے ہیں
اور دروازے کی طرف منہ کرکے کھڑے ہو جاتے ہیں)

مسٹر دربار (کڑک دار آواز سے) ملزم کھیت کھلیان حاضر ہے؟

(مسٹر دربار اسی پھرتی سے چپراسی اتار کر ہتھکڑی پہن کر اوٹ کے بنے ہوئے
ملزموں والے کٹہرے میں آجاتے ہیں)

مسٹر دربار (مردہ خوشامد بھری آواز میں) حاجر جور، جور آپ مائی باپ ہیں۔ جور ہم بہت گریب منئی ہیں۔ جور بڑھیا ماں ہے، چھ بچے ہیں جور اور چار چھوٹے بھائی ہیں۔ جور میں ہی اکیلا کمانے والا ہوں۔ جور —— جور —— دیا کرو —— جور۔

(مسٹر دربار اسی پھرتی سے ہتھکڑی اتار کر گدے دار کرسی پر آجاتے ہیں اور
وِگ پہن لیتے ہیں)

مسٹر دربار۔ کیوں وکیل سرکار، تمہارے پاس اس ملزم کے خلاف کیا ثبوت ہے؟

(مسٹر دربار اسی پھرتی سے وِگ اتار کر نئی گون پہن کر میز کے داہنے کنارے
آکر کھڑے ہوتے ہیں)

مسٹر دربار (رسمی لہجے میں) می لارڈ۔ سی، آئی، ڈی صاحب بہادر کی شہادت موجود ہے ایسا ویسا سی، آئی، ڈی بھی نہیں۔ بہت بڑی حیثیت کا سی، آئی، ڈی۔ تنخواہ ڈھائی سو ماہوار اور الاؤنس ساڑھے سات ہزار ماہوار۔

(مسٹر دربار اسی پھرتی سے گاؤن اتار کر، وِگ پہن کر جج کی کرسی پر آتے ہیں)

مسٹر دربار۔ کوئی دوسری شہادت؟

(مسٹر دربار اسی پھرتی سے وِگ اتار کر نئی گون پہن وکیل سرکار کی جگہ

آتے ہیں)

مسٹر وربار۔ می لارڈ دوسری میری شہادت ہے۔ یعنی سی، آئی، ڈی صاحب بہادر کی دستخطی رپورٹ۔

(مسٹر وربار اسی پھرتی سے وِگ اتار کر پھٹی گون پہن لیتے ہیں اور بڑے میز کے بائیں کنارے کی طرف آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

مسٹر وربار۔ (آواز میں خوشامد) می لارڈ، یہ بیرامر کل بالکل گنوار ہے۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔ بھلا یہ تقریر کیا کر سکتا ہے۔ حضور عالی پچھلی عدالتوں میں ایک گواہی بھی ایسی نہیں ملی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ زندگی بھر میں کبھی تقریر کی ہے یا کر سکتا ہے

(مسٹر وربار گاؤن اتار کر وِگ پہن کر بہت وقار سے کرسی پر بیٹھتے ہیں اور فیصلہ لکھتے ہیں پھر سیاہ ٹوپی پہن لیتے ہیں)

مسٹر وربار۔ ملزم مسمی کھیت کھلیان۔ تم پر باغیانہ تقریر کرنے کا الزام لگایا گیا۔ تم اسکی کوئی صفائی پیش نہیں کر سکے۔ ایک باوقعت شخص کی شہادت اور ایک تحریری شہادت تمہارے خلاف جرم ثابت کرتی ہیں۔ اس لئے ایں جانب تم کو پھانسی کی سزا دیتے ہیں۔ کل ٹھیک بارہ بجے دن کو تمہارے گلے میں رسی باندھ کر تم کو اتنی دیر لٹکایا جائے کہ تمہارا دم نکل جائے ـــــ عدالت برخاست

(مسٹر وربار ٹوپی اور وِگ اتار کر ہاتھ میں مقدمے کی مسل لئے ٹہلتے ہوئے بڑے صوفے پر آ کر اپنی پرانی نشست پر بیٹھ کر سگار پینے لگتے ہیں۔ پھر تالی بجاتے ہیں)

(چپراسی فوراً اندر آتا ہے اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

چپراسی - حاضر حضور

دروربار - پیشکار کو بھیجدو۔

(چپراسی جاتا ہے پیشکار آتا ہے اور جھک کر آداب بجا لاتا ہے)

دروربار - ملزم کھیت کھلیان کے خلاف جرم ثابت ہے - پھانسی کی سزا دی جائے گی۔ یہ لو فیصلہ - ٹائپ کر رکھو - وقت پر تیار رہے

پیشکار - جیسا حضور کا حکم ہو

(دروربار فیصلہ پڑھتا ہے - پیشکار ادب سے ہاتھ میں لیتا ہے)

ڈراپ

طنزیہ افسانے

انوکھی مصیبت (صفحہ ۷)

پرواز

سہانا سپنا

ہانمت

پرواز

ملک میں امن کا سناٹا چھایا تھا۔ زندگی مدھم سروں پر چل رہی تھی، جیسے جاڑوں میں ندی کی سطح پر سوکھا پتا۔ جناب مولانا اپنی خانقاہ میں فنا فی المرشد پڑے رہتے تھے اور حضرت مجتہد اپنے خلوت کدے میں فنا فی الامام۔

جناب مولانا کے صاحبزادے کے جی میں جانے کیا آئی کہ انہوں نے ایک پتنگ پر مدح صحابہ لکھ کر اڑا دی۔

اتفاق سے مجتہد زادے بالاخانے پر تھے۔ ان کی نگاہ پڑ گئی۔ آنکھوں کی لگی تلووں میں بجھی، شور اٹھا، ہلچل مچ گئی۔ میر صاحب دوڑے ہوئے اتن صاحب کے پاس پہنچے اتن صاحب اچھن صاحب کے ہاں گئے۔ پھر سب حضرت مجتہد قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

"ظلم ہے"۔

"سراسر ظلم ہے۔"

"اندھیر ہے۔"

"سراسر اندھیر ہے۔"

ایک گروہ کی جو جہاندیدہ تھا رائے ہوئی

"مجلس منعقد کرو۔"

"صفِ ماتم بچھاؤ۔ کچھ نوحہ خوانی ہو، کچھ تعزیہ داری ہو۔"

قبلہ زادے کا جوان خون اندر ہی اندر کھولنے لگا۔ انہوں نے ان اگلے وقتوں کے لوگوں کو تو چھوڑا زمین پر، خود اپنے ساتھیوں کو لے کر پہنچے چھت پر اور تبرّا شریف لکھ لکھ کر پتنگ بڑھا دیئے۔ ذرا دیر میں گستاخ پتنگ کو گھیر لیا۔ پھر تو باہم ہدایات چلنے لگیں۔

"ارماں وا بہنے سے آئے۔"

"بابا یاں تم سنبھالو۔"

"بچا کر۔"

"دے ڈھیل۔"

"کھینچا ہے، کھینچا ہے۔"

مذہبی پتنگ نے ہراول کو خالی دیا۔ میمنہ سے کترا کر نکل گیا۔ میسرہ کو قلم کیا مگر قلب کا کھڑا وار نہ برداشت کر سکا۔ بچارے کا رشتۂ حیات منقطع ہو گیا۔

"وہ مارا ہے۔"

"وہ مارا ہے۔"

"دُھ مارا ہے"

نوجوان شیعہ، جہاندیدہ بزرگ اور حضرت قبلہ سب کے چہروں پر حسرت نے سُرخ مہتابی چھوڑ دی۔

شہید تنگ ہوا میں تیانے لگا کبھی داہنا بازو بائیں پر تو کبھی بایاں داہنے پر۔ کبھی سر نیچے ہے تو کبھی ٹانگیں اوپر۔

بچارے مولانا زادے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہائے بچارا تنگ، نرغۂ اعدا میں گھر گیا تھا۔

حسرت پہ اس مجاہد بے کس کے رویئے

ہمدردی کے لئے سنیوں کی دنیا مولانا کی خانقاہ میں سمٹ آئی۔

"غضب کر دیا شیعوں نے"

"ستم کر دیا شیعوں نے"

"الانتقام، الانتقام"

"الجہاد، الجہاد، ثم الجہاد"

ایک طرف مرحوم تنگ کا جنازہ اُٹھا اور دوسری طرف لاکھوں مدحیہ تنگ آسمان پر چھا گئے۔ نوجوان سنیوں نے نعرہ لگایا۔

مر مر کے زندہ ہو گی مردانگی ہماری

قبلہ زادے نے جو یہ یلغار دیکھی تو "المدد" کا نعرہ لگایا۔ تمام شیعہ دوڑ اور تنگ لے لے نعرے لگاتے دوڑ پڑے۔

"آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا"

"الجہاد الجہاد الجہاد الجہاد۔"

ادھر سے رنگ برنگ مدحیہ پتنگ، ادھر سے سُرخ و سبز و سیاہ تبرائی پتنگ، آسمان پر بس پتنگ ہی پتنگ، پتنگ ہی پتنگ، ہلالی پتنگ، علمی پتنگ، چاند تارا پتنگ، سورج مارکہ پتنگ، پتنگوں کا وُہ زور ہوا کہ ابابیلوں نے پتنگوں کا شکار اور گِدوں نے مردے کی تلاش میں پرواز چھوڑ دی۔

(۲)

جناب مولانا نے فتویٰ دیا کہ تبرائی پتنگ کو کاٹ دینا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ایک پتنگ کاٹو ایک حج کا ثواب لوٹو۔

حضرت قبلہ نے فتویٰ دیا کہ مدحیہ پتنگ کو کاٹ دینا ہر مومن پر فرض ہے اور اگر کٹ جاؤ تو کٹنے کا اجر اجرِ شہادت سے کم نہیں۔

دکانیں، کارخانے، بازار اور ملیں سب بند۔ اب مسلمان یا تو پتنگ بناتے تھے یا اڑاتے تھے۔

ہاں ایک بازار میں اب بھی گرم بازاری تھی۔ وُہ تھا پتنگوں کا بازار، جدھر دیکھو، ادھر پتنگوں کا ڈھیر لگا ہے۔ بڑے پتنگ، چھوٹے پتنگ، کاغذی پتنگ، ریشمی پتنگ، ہوائی پتنگ، آندھی پتنگ، زہریلا مانجھا، رنگیلا مانجھا، سنگین مانجھا، آہنی مانجھا۔

پتنگوں کی دکانوں کے سامنے عجب بہار رہتی۔ امیر غریب، شریف رذیل سب کی بھیڑ لگی رہتی، کوئی کانپ ٹھڈا دیکھ رہا ہے، کوئی کاغذ کا زور اندازہ رہا ہے۔ ایک شور مچا ہوا ہے۔ "کیا دام ہیں؟" "کیا اک تارا پتنگ نہیں ہے؟" "ارے ادھر میاں ادھر" —— بھائی ادھر۔"

دکاندار ہر ایک کو جواب دے رہا ہے۔ "نہیں سرکار نہیں"۔ "حضور کم کیسے کریں، ہم نے قوم کی خدمت میں دام پہلے ہی سے بہت کم کر رکھے ہیں"۔ "بے صاحب ہے، ہر طرح کا مال ہے"۔

پتنگوں کے سامنے خوش نویسوں کے اڈے تھے۔ کوئی چٹائی پر بیٹھا ہے کوئی میز کرسی پر، کوئی کلک کا قلم اور بالو کی ڈبیا لئے بیٹھا ہے، کوئی ڈاؤ نٹین پن، کوئی اعجاز رقم ہے تو سہل ممتنع نویس، کوئی مولوی فاضل ہے کوئی گریجوٹ، ہاتھ میں گھنٹی لئے بجا رہے ہیں اور صدا لگا رہے ہیں۔

"لکھوائی چار آنے، صرف چار آنے"۔

"نہیں آنے بھائی صرف تین آنے"۔

"لکھوائی گیارہ پیسے، مدح صحابہ لکھواؤ چاہے تبرا"۔

بازار کے بیچ سے اخبار کے چھوکرے صدا لگاتے نکلتے ہیں۔ شیعہ اخباروں کی پلٹن نکلتی ہے

"کیا ڈھیل چھوڑی جناب قبلہ و کعبہ نے"۔

"بیدار ہو، بیدار ہو اے قوم ہماری"۔

"مولانا کی ساری پھسپھسا گئی"۔

سنی چھوکروں کی پلٹن نکلتی ہے۔

"کیا قد مارا ہے جناب مولانا نے"۔

"مشرق کا سرا لے کر مغرب سے ملا دیں گے"۔

"اکھڑ گئے ہتھے سے جناب قبلہ و کعبہ"۔

مسجد کی سیڑھیوں پر پیر فقیر رخدا رسیدہ مجتہد بیٹھے ہیں۔ گرد حاجت مندوں کا میلہ لگا ہے

"یا حضرت ذرا ترچھا جاتا ہے۔"

"تو مٹھڑے میں یہ گنڈا باندھ لو۔"

"یا قبلہ و کعبہ کتنے ڈھیلے بنتے ہیں۔"

"لو یہ امام ضامن لٹکا لو۔"

"میاں جی، ہمرا بات گھیسٹم ماں نہیں چلت ہے۔"

"لے یہ پھلیا لے۔ دھونی دے لے۔"

حضرت قبلہ کے امام باڑے اور ذاتی خلوت کدے کی، جناب مولانا کی خانقاہ اور ذاتی گوشۂ عافیت کی اب دنیائیں بدل گئی تھیں۔ ان مقاموں میں اب مسجدوں میں ماتھا گھسنے والے گڑگڑا گڑگڑا کر جنت مانگنے والے، تسبیح کے دانوں کو پتلا کرنے والے، امام کے نام پر ڈاڑھیں مارنے والے یہ سب ناپید ہو چکے تھے۔ یہ عمارتیں اب قلعہ تھیں۔ جہاں سے سرفروش مجاہد ناموس مذہب کا دفاع کرتے تھے اور اعدائے اسلام کی سرکوبی کرتے تھے۔ دن رات میں جس وقت بھی جاؤ نقل و حرکت کی ہماہمیں، رجزیہ کلمات اور فتح کے نعرے سننے میں آتے تھے۔

"اوپر سے جا اوپر سے ابے گھامڑ ....."

"کھینچ گدھے، کھینچ ....."

"تیرے باپ نے بھی پتنگ اڑایا تھا ....."

"یہاں اسی میں گاؤں کے گاؤں اڑا دیئے۔ چلا ہے وہاں سے ....."

"وہ کاٹا ہے"

"ایک نعرۂ حیدری"

"......"

"مولانا کی ایسی تیسی...."

"وہ مارا ہے...."

"ایک نعرۂ تکبیر...."

"......"

"دھت تیرے قبلہ کی...."

قوم پر نازک وقت آپڑا تھا، ایسی حالت میں جناب مولانا اور حضرت قبلہ اپنے خلوت کدۂ اور گوشۂ عافیت میں کہاں ٹک سکتے تھے، ان ٹھنڈی رگوں میں بھی خون تیزی سے چلنے لگا جوانوں کے دوش بدوش یہ پیر زمین گیر بھی آکھڑے ہوئے، اب تو یہ حال ہے کہ دن رات میں جب بھی دیکھو، دونوں بزرگ عبا کمر سے لپیٹے، عمامہ سنبھالے، موٹی تال کی عینک کے پیچھے سے تاک تاک پیچ پر پیچ لڑا رہے ہیں۔ مقدس داڑھیاں ہواہیں اُڑ رہی ہیں۔ کبھی کبھی ایک حادثہ بھی پیش آجاتا۔ داڑھیاں ڈور سے اُلجھ جاتیں اور پیچ میں پیچ ڈال دیتیں۔

داڑھیوں کا مسئلہ بھی جلد ہی حل ہو گیا۔ جہاد میں داڑھی منڈوانا جب جائز ٹھہرا تو اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے؟ فائدہ ضرور اُٹھانا چاہئے جو چیز حلال ہے اسے اپنے اوپر حرام مت کرو فتوے کا ملنا تھا کہ حجاموں نے ذرا سی منھ بھیری کر کے سن سفید بالوں کے نیچے سے چمکتی ہوئی جھریوں والی کھال نکال کر سامنے رکھ دی۔ اب تو شیر دل مولانا اور قبلہ، نوجوانوں اور امردوں کی صف میں کھپ گئے۔

جب قوم کے عروج و زوال کا سوال سامنے آجائے تو نوجوانوں سے کہاں نچلا بیٹھا جاتا ہے۔ ادھر تو دکانیں اور کارخانے بند ہوئے اور ادھر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں میدان لڑنے لگے۔ اس وقت آزادی کا مسئلہ سامنے ہے اور صرف پتنگ بازی سے حل ہو سکتا ہے۔ ایسے میں کہاں کی تاریخ اور کہاں کی سائنس، بڑے بڑے جلوس نکلنے لگے

"ہاں بہادرو!

"پتنگ لڑاؤ"

"میرے بہادرو!

"پتنگ لڑاؤ"

کلاسوں کی چھتوں پر سے میدان لڑنے لگے۔ شیعہ ادھر ہو گئے سُنّی ادھر، کھینچم تان دھر گھسیٹ ہونے لگی۔

پروفیسروں کو بہتیرا سمجھایا گیا کہ پتنگ بازی میں تمام علمی اور اخلاقی خوبیاں موجود ہیں۔ اس میں بلندی بھی ہے اور پرواز بھی۔ جگر سوزی بھی ہے اور مال و وقت کی یعنی جان کی قربانی بھی مگر ان کتاب کے کیڑوں کی سمجھ میں بات خاک نہ آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں بند ہو گئیں۔

اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں بند ہو گئیں۔ لیکن تعلیم نہیں بند ہوئی۔ سرفروش مجاہدوں نے کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں قوم کے نونہالوں کو جاہل نہیں رہنے دیں گے۔ اس لئے سینکڑوں شیعہ مدارس کھل گئے۔ دن بھر مجاہدین پتنگ بازی میں لگے رہتے۔ شام کو ذرا سا وقت نکال کر مدارس میں تعلیم دیتے۔ جناب مولانا اور حضرتِ قبلہ مدارس میں بذاتِ خود تشریف لے جاتے اور مدرسین اور طلباء کی ہمت افزائی کرتے۔

چونکہ کم وقت میں تعلیم دینا مقصود تھا۔ اس لئے نصاب بہت کڑا رکھا گیا۔ مثلاً "پتنگ اور کنکوے میں کیا فرق ہے؟" "گھسیٹم کے موقع پر ذاتی غصے کا پارہ کس ڈگری پر رہنا چاہئے" یہ صرف ایک ہفتے میں سکھلا دیا جاتا تھا ــــ پتنگ بازی کا ادب یعنی "وا بے" اور "کھینچ گدھے" کا مطالعہ صرف دو ہفتوں میں۔ عملی تجربہ چار دن۔ "فحش گو ہیں" "بدتمیز ہیں" اور اس قسم کے فقروں کا مخالفوں کے لئے برمحل استعمال اور "خوب کھی" "اچھی پھبتی اڑائی" کا اپنوں کے لئے بے محل استعمال۔ یہ دونوں صرف چار دن میں۔ مگر شروع میں طالب علم ایسی تیز ترقی کر رہے تھے جیسے برسات میں کائی۔ وقت سے پہلے وہ ایم۔ اے ہو جاتے۔

پروفیسروں نے اپنی غلطی کی تلافی یوں کی کہ پرانے پتنگ بازوں کی قبریں جن کو مرحوم و مغفور ہوئے ایک صدی سے زیادہ گزر چکا تھا۔ ڈھونڈھ نکالیں اور تحفے میں جناب مولانا اور حضرت قبلہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ مجاہدوں نے ان قبروں پر منتیں مانیں، بخور سلگائے پھول چڑھائے اور بتاسے بانٹے۔ رنگین مزاجوں نے قوالوں کی "آہ سے واہ ہے" کا بندوبست کیا۔ پھر تو وہاں رنڈیوں کا گانا اور ٹوٹنکیاں بھی ہونے لگیں۔

پرانے مزاروں اور کربلاؤں کی جگہ قوم کے نو دریافت عرسوں نے لے لی۔

جب سب اپنی اپنی خدمات جناب مولانا و حضرت قبلہ کی خدمت میں پیش کر رہے تھے تو بھلا شعراء کیوں پیچھے رہتے۔ انہوں نے فوراً ایک مشاعرہ منعقد کر دیا۔ حاصل مشاعرہ یہ شعر رہا

یار میرے پتنگ اڑایا کر یہ کٹی وہ کٹی ہنسایا کر

(۱۶)

مفلسی تیرا خانہ خراب ہو۔ ہر نیک کام کو تو برباد کرتی ہے۔ آخر اس سے حضرت

مجاہدے پر بھی تو نے ہتھ پھیری کہہ دی۔ مجاہدین پتنگ اڑاتے رہے اور ان کی جیبیں خالی ہوتی رہیں۔ چندے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب جوشیلے جوانوں کو پھیری لگانے پر ایک پیسہ بھی نہ ملا۔ درسی کتابیں اور قدیم و جدید کتب خانے تو پہلے ہی پتنگوں کی شکل میں اڑ چکے تھے۔ مجاہدین کے گھروں کے دوپٹوں، مسجد کے مصلوں اور قرآن کی جزدانوں کی باری آئی اور وہ بھی بات کہتے میں اڑ گئے۔ اب تو آسمان کے نیچے ہتھیلیوں میں صرف لکیریں رہ گئی تھیں اور آسمان کے اوپر صرف تارے۔

جب ایسا وقت آپڑا تو مولانا اور قبلہ کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ دونوں نے اپنے استادوں اور مرشدوں کے عطا کئے ہوئے عمامے سر پہ رکھے، خاندانی عبائیں کندھے پر ڈالیں ـــــ پھر گلے میں لٹکائیں جھولیاں اور گلی گلی گھومنے لگے۔ در در صدائیں لگانے لگے۔

اللہ تجھ کو روزی دیجے دے پتنگ کی راہ میں
مائی تیرا لال جیوے دے پتنگ کی راہ میں
ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا دے پتنگ کی راہ میں

پھر تو دھن برس گیا۔ ایسا برسا کہ بیواؤں کے سیاہ و سفید دوپٹے اور یتیموں کی نئی اور پرانی چپلیں تک چندے میں آگئیں۔

پھر اچھے دن آگئے۔ پھر آسمان پر رنگینیاں چھا گئیں۔ پھر وہی شور، وہی نعرے اور وہی حضرتِ قبلہ اور جناب مولانا کے گرد گرد مجمعے۔

(۴)

دھن برستا رہا، پتنگ اڑتے رہے۔ لیکن یہ بارش اور یہ پرواز سب ایک ناگہانی

حادثے سے ختم ہو گئیں۔ برسات آگئی۔ پتنگ گل گل کر لیدی بن گئے۔ مانجھا ایسا سیلا کہ اس سے شوربہ بہنے لگا۔ ساوی پر پھپھوندی لگ گئی۔ تجاہین پر وہ نزلہ گرا کہ وہ جو آواز بھی زبان سے نکالتے، سننے والے کے کان میں صرف نون غنہ پہنچتا۔

بدلیاں گھر رہی ہیں اور ٹوٹ ٹوٹ برس رہی ہیں۔ ایک پلنگ پر جناب مولانا اور کہیں ایک دوسرے پلنگ پر حضرت قبلہ چاروں خانے چت پڑے ہوئے ہیں۔ ہاتھوں میں پتنگوں کی لیدی ہے۔ جس کو مل رہے ہیں اور ظالم آسمان کی طرف دیکھ دیکھ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہیں۔ یہ لیدی؟

طاق مسجد کے بھرے مانگیں مرادیں قتیں
جو نہ کرنا تھا کیا او دلربا تیرے لئے
اب اس کا کیا بنائیں؟ گڑ بھرا ہنسیا نہ نگلتے بنے نہ اُگلتے بنے۔

سہانا سپنا

مجھے تو اب مندر کے گھنٹے میں مزا ملتا ہے اور نہ مسجد کی اذان میں۔ جانے وہ زمانہ کہاں گیا۔ جب خداگھروں کے سامنے زندہ لاشیاں چلتی پھرتی تھیں۔ رجزیہ کلمات اور جوش بھرے نعرے سننے میں آتے تھے۔ یہی گھنٹہ تھا اور یہی آواز تھی جنہیں سُنکر خون جوش مارنے لگتا تھا۔ سینے میں تناؤ جلال میں اکڑ پیدا ہو جاتی تھی ——— میں تو اب خداگھروں کا رُخ بھی نہیں کرتا، کون پیئے ٹھنڈی چائے۔

رات میں لیٹا سوچ رہا تھا کہ میرے ایسے نہ جانے کتنے سینے ہوں گے جن کا جوالامکھی اندر ہی اندر گھٹ رہا ہوگا۔ خونِ دل پینے کو ہے اور لختِ جگر کھانے کو ——— سوچتے سوچتے آنکھ لگ گئی ——— پھر تو وہ کچھ دیکھا کہ ساری کوفت ہوا ہو گئی اور وہ روحانی مسرت حاصل ہوئی ہے ——— دیکھتا کیا ہوں کہ ———

مگر نہیں۔ بات یہ ہے کہ خواب میں صورتیں اور الفاظ کچھ ایسے مبہم اور ———

دو ہی جیسے ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے شرط یہ ہے کہ

آپ ہندو ہیں تو لکیروں کے اوپر کے الفاظ کاٹ کر پڑھیے

آپ مسلمان ہیں تو لکیروں کے نیچے کے الفاظ کاٹ کر پڑھیے

میں نے خطرے کی جھنڈی دکھا دی ہے۔ اگر آپ نے ہدایات پر عمل نہ کیا غلط کیا اور کچھ بھگتنا پڑ گیا تو میں ذمہ وار نہیں —— صاف بات اچھی ——

دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بہت بڑی منڈی ہے۔ وہاں پانچ پانچ سو ہندو/مسلمان رسیوں میں بندھے، گلوں میں کھڑے ہیں اور فروخت ہو رہے ہیں۔

ہائیں۔ یہ کیا؟ مگر فوراً ہی یاد آ گیا کہ مولانا صاحب/پنڈت جی فرما چکے ہیں کہ ان کو تم بھیڑ بکری/گاجر مولی سمجھو۔ اچھا، تو یہ بات ہے۔ ذرا چلو ہم بھی دیکھیں کیسا کیسا مال آیا ہے

مال خوب خوب تھا۔ چوڑی ہڈیوں والے پنجابی اور سرحدی۔ ملائم پیٹ والے بنگالی۔ کرارے گوشت والے دکھنی۔ بعض بعض پٹھے تو ایسے تیار تھے۔ چربیلا بدن۔ چمکتی ہوئی چکنی چکنی کھال کہ مکھی بیٹھے تو پھسل جائے۔ ایک طرف چھ چھ ماہ کے بچے بھی تھے۔ ملائم ملائم بے ریشے کا گوشت۔ بھلا ان کے سامنے مہاشیر یا ہرنی کیا چیز ہے۔ ان کو تو ملائی سمجھو۔ میں نے ایک جوڑ بچے چھانٹ کر ان کے دام پوچھے۔

والنٹیر نے بہت ادب سے کہا مولانا/شری مان یہ مال صرف بیماروں کے لئے ہے آپ پٹھے کیوں نہیں لے لیتے۔"

بات مناسب تھی۔ قوم کو بیماروں کا خاص خیال کرنا چاہئے۔ والنٹیر دوڑ گیا اور

ایک نوجوان مادین کو رسی پکڑ کر کھینچ لایا اور گھما پھرا کر ہر رُخ سے مجھے دکھایا۔ مال واقعی خوب تھا۔ کولھوں پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ دست کی مچھلیاں اور کریلی کی بوٹیاں۔ رانیں ایسی کسی کسی کہ مسلم پکاؤ۔ سُرخ گالوں کے سُرخ سُرخ تکے۔ کیا کہنا! کراری کھیری کے خستہ خستہ کباب۔ واہ واہ!

پھر والنٹیر نے اس کا سر ٹھونک کر بجایا۔ آواز سے اندازہ ہوا کہ بھیجا بڑا نکلیگا۔

میں۔ کیوں بھائی دام کیا ہوں گے

والنٹیر۔ پانچ روپیہ۔

میرے ایسے غریب کے لئے یہ دام بہت تھے۔ میں نے جسم پر للچائی نظر ڈالی اور کہا۔

"بھائی چوتھائی مال کاٹ کر نہیں دو گے"

"لائیے سوا روپیہ"

میں نے کھیٹ سے بیس آنے نکال کر دیئے۔ اُس نے مادین کی رسی مجھے پکڑا دی اور کہا

"لیجئے سب لے جایئے"

میں رسی کھینچتا ہوا اسے گھر لے آیا۔

(۲)

جس وقت پلاؤ کی دیگ کھولی گئی ہے تو سارا گھر مہک اٹھا۔ بوڑھے بچے خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ وہ دوڑ دھوپ اور چہل پہل ہوئی ہے

"وہی آ گیا"

"برف آگیا"

"لڑکے آگئے!"

لڑکے چیختے ہوئے دوڑے "ہم آگئے۔ ہم آگئے"

"بوڑھی دادی کہاں ہیں؟ بوڑھی دادی کہاں ہیں؟"

"ان کو بلاؤ۔ ان کو بلاؤ"

"ہاں ہاں یوں نہ چبے گی تو دو چار چاول تو حلق سے اتار ہی لیں گی"

دیوار کا سہارا لیتی، کھانستی کھنگھارتی، بوڑھی دادی آپہنچیں۔ سب نے کھانا شروع کر دیا۔ اتنے میں ننھا رونے لگا۔

"کھاؤں کھاؤں کھاؤں۔ کھاؤں کھاؤں کھاؤں"

"کیا بات ہے"

"بھوکا ہے ...."

میں سوچنے لگا کہ ایسے میں دس بھائیوں کو بلا کر کل بھیا کی شوربہ چٹائی (کا مونڈن) کیوں نہ کر دوں۔ بڈھے مال یوں تو ہمیں آنے میں دو مل جائیں گے۔ کام بن جائے گا

کھانے والے چٹخارے مار رہے تھے اور تعریفیں اڑا رہے تھے۔

"کیا گوشت ہے!"

"واہ وا!"

"کیسی ملائم کری ہے!"

"واہ وا!"

"دل ہوتا تو ہے ان کم بختوں کا سیاہ —— مگر کیا مزا ہوتا ہے"

"اہا ہا ہا ——"

"اور بھیجا —— یہ کیسے مزے کا ہے۔"

سب ڈٹ کر بڑی بڑی ڈکاریں لیتے، خدا کا شکر بھیجتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سب آسودہ تھے اور سب خوش۔ صرف مجھے ایک ذرا سی کوفت تھی۔ وُہ یہ کہ بیچاری بوڑھی دادی بوٹی نہ کھا سکیں (بھیجے کا شمار بوٹی میں نہیں) اگر ان کے نام پہ مانگتا تو وہ اللہ کا بندہ ایک بچہ تو دے ہی دیتا۔ کیا کہوں۔ اس وقت یہ بات خیال میں نہیں آئی۔

لیکن بوڑھی دادی بہت خوش تھیں کہ دو چار چاول تو میرے حلق سے اتر ہی گئے اب میرا ~~حشر و نشر~~ دوسرا جنم ضرور اچھا ہوگا۔

میں نے اپنے دل میں کہا "رہ جاؤ۔ اس غلطی کی تلافی ضرور کروں گا۔ کل ایک بچہ بھی لاؤں گا۔"

پائلٹ

۱

اس زمانے کا قصہ ہے جب لوگ دُنیا کے پندرہ ہزار برس پرانے تمدن موہنجوداڑو کی نشانیاں کھود کھود کر نکال رہے تھے۔ ایک شام کو کام سے فارغ ہو کر جیسے ہی ہم لوگ کیمپ پر آئے۔ چاروں طرف سے بادل گھر آئے اور کھانے سے فارغ ہونے تک تو اتنا اندھیرا ہو گیا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ کوندھا لپک رہا تھا۔ اس کی روشنی میں ہماری کھدائی سے بنے ہوئے ٹیلے اور گڑھے بجید بڑے اور پُراسرار معلوم ہو رہے تھے۔ اتنے میں ہم نے سر پر ایک گھڑگھڑاہٹ سی سنی۔ اُوپر اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ گڑگڑاہٹ بہت تیزی سے بھاگتی ہوئی موہنجوداڑو کے کھنڈروں تک پہنچ کر بند ہو گئی۔ اتنا تو سب کو یقین ہو گیا کہ یہ بادل کی گرج نہیں ہے۔ پھر کیا ہے؟ میرا خیال تھا کہ کوئی ہوائی جہاز ہے جو مشین کی خرابی کی وجہ سے نیچے اُترنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ لیکن میرے دوسرے ساتھی پروفیسروں کو اس میں شک تھا۔

تھوڑی دیر میں کھنڈروں کے پاس پھر وہ آواز سنائی دی۔ اتنے میں کوندا لپکا دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بہت بڑا پرندہ اڑا جا رہا ہے۔ اس کے پروں پر سرخ، نیلے، زرد اور سبز رنگ سے معلوم ہوتے مگر ایک دوسرے میں ایسے ملے جلے نظر آئے کہ یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ کون حصہ کس رنگ کا ہے کہ میں نے اس کے پروں کی حرکت جو دیکھی تھی وہ مجھے قدرتی نہیں مصنوعی معلوم ہوتی۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ وہ ہوائی جہاز ہے لیکن میرے ساتھیوں کو اب بھی شک تھا۔

صبح کو جب ہم لوگ موہنجو دارو کے کھنڈروں میں پہنچے تو وہاں کی نرم مٹی پر ایسا نشان ملا جو صرف کسی لوہے کی مشین کا ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھیوں کا شک اب بھی دور نہیں ہوا تھا کہ اتنے میں کتاب پر نگاہ پڑی۔ میں نے دوڑ کر اسے اٹھایا تو وہ کتاب نہیں ایک کاپی تھی۔ جس کی تحریر تو میں اس وقت نہیں پڑھ سکا مگر اس کے وجود نے میرے ساتھیوں کا شک دور کر دیا۔

کاپی کی جلد پر جو نقش و نگار تھے، وہ ایسے انوکھے تھے کہ بہت غور کرنے پر بھی نہیں طے ہو سکا کہ یہ کس تمدن کی پیداوار ہیں۔ اس میں کرسیوں پر کرسیاں اسی طرح بنی ہوئی تھیں جیسے بدھ گیا کے مندر پر مگر ان میں کنگورے اس طرح کھپے ہوئے تھے کہ دونوں چیزیں الگ نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ کنگوروں کی بناوٹ گاتھک تھی۔ انسانی شکلوں کا تناسب وہی تھا جو الورا اور اجنتا میں نظر آتا ہے لیکن گردن کی لمبائی میں مصری آرٹ کی شباہت تھی۔ عمارتوں کی بناوٹ میں ہندو کاریگری کی دیدہ ریزی سے کچھ ایسے نقوش بنے تھے، جو قصر الحمرا کے طغروں سے ملتے جلتے تھے۔ بعض بعض شکلیں ایسی بھی تھیں جو چینی اژدہے سے مشابہ تھیں۔ یہ سمندر سمندر کے موتی اس طرح پروئے ہوئے تھے کہ مل کر اک رنگا

ہار بن گئے تھے

نمدنوں کا اتنا گہرا ملاپ نہ تو دو چار شخص پیدا کر سکتے ہیں اور نہ اس کے لئے ایک آدھ صدی کافی ہو سکتی ہے۔ یہ آرٹ کسی متمدن قوم کی صدیوں کی ترقی کی نشانی معلوم ہوتا تھا مگر سوال یہ اٹھتا تھا کہ خیالات و جذبات کا وہ مشترک رشتہ کیا ہو سکتا ہے جس نے ایسے رنگ برنگ موتی منتخب کر لئے؟

جلد کے نقوش کی طرح کاپی کی زبان اور رسم خط بھی مختلف زبانوں اور خطوں کا معجون مرکب تھا۔ اس وجہ سے ایسے اشارے مل گئے کہ پڑھنے میں زیادہ وقت نہیں اٹھانا پڑی یہ کسی شخص کی ڈائری تھی۔ اُسے پڑھکر مجھے اتنی حیرت ہوئی جتنی زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ واقعہ ہے اور نہ یہ یقین آتا تھا کہ دُنیا میں کوئی ملک ایسا ہو سکتا ہے۔ جہاں سائنس اور فلسفہ اتنی ترقی کر گئے ہوں اور پھر بھی وہ نگاہوں سے اوجھل ہو اگر میں نے وہ عجیب ہوائی جہاز اپنی آنکھوں سے تندرستی کی حالت میں نہ دیکھا ہوتا تو میں اس ساری تحریر کو کسی تخیل پسند مصنف کی پرواز خیال سمجھتا۔

ڈائری کے لئے پڑھنے والا اب اتنا بے چین ہو گا کہ اسے میری حیرت کی رام کہانی سے الجھن ہونے لگی ہو گی۔ اچھا لیجئے ڈائری دیکھئے۔ اتنا اور بتا دوں کہ ڈائری میں بہت سے انگریزی، سنسکرت، فرانسیسی، چینی اور پراکرتی زبانوں کے الفاظ تھے جو اپنی اپنی جگہ پر بالکل ناموزوں معلوم ہوتے تھے ... عجیب تمدن میں پہنچکر ان کے معنی بدل گئے تھے میں نے قیاس سے ان کی جگہ بامعنی الفاظ رکھدیئے ہیں۔ جہاں جہاں موزوں لفظ نہیں ملا وہاں اسی زبان کا ترجمہ کر دیا ہے۔ ان باتوں کی تشریح جا بجا حاشیہ میں (جس کا ڈائری کے ساتھ ساتھ دیکھنا بہت ضروری ہے) کر دی گئی ہے۔

ڈائری

۱۲ ارسمجھ[1] سنہ ۱۴۰۰ نند[2] میں بال بال بچ گیا ورنہ بڑی بُری موت کا شکار ہو گیا ہوتا۔ جان بچنے کو تو بچ گئی مگر دماغ کو ایسا دھچکا پہنچا ہے کہ ابھی تک حواس بجا نہیں۔ دل ایسا کانپ رہا ہے جیسے پانی پر تیرتا ہوا پتّہ۔ کیسی آفت آگئی! ابا تو گول بازار میں اتنی چہل پہل تھی یا دیکھتے دیکھتے یہ حال ہو گیا کہ بچے چیخے کرتے اور ساریاں ادھر ہیں تو گھبراہٹ میں چھوٹی ہوئی ٹوپیاں اور جوتیاں ادھر۔ ادھر زخمی سسک رہے ہیں تو ادھر کچلی کچلائی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ حالت یاد کر کے اپنے جان بچنے کی خوشی بھول جاتا ہوں۔ بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ کیسا غضب ہے! کیسا اندھیر ہے! کیسی اچانک تباہی ہے!

آج دن بھر وہ لُو کے جھکڑ چلے! وہ گرد و غبار اڑا! سورج کو دیکھو تو معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس کی کھال کھینچ لی ہے اور نیچے سے جیتا جیتا گوشت نکل آیا ہے۔ دن بھر لوگ تو گھروں میں دبکے پڑے رہے اور سڑکوں اور گلیوں پر بگولوں کے غول ناچتے رہے۔ اس گرمی کی شدت کی کسر یوں نکلی کہ ادھر سہ پہر ہوئی، لُو رکی اور شمالی ٹھنڈی ہوا کا پہلا جھونکا آیا کہ لوگ نہا دھو، کپڑے بدل، گھروں سے نکل پڑے۔ آج کی اتنی بھیڑ تو مہینوں سے گول بازار میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

شربت والوں، گنڈیری والوں اور بالائی کی برف والوں کی صدائیں، ہزار دل بقدموں

---

[1] اس سن اور ان مہینوں کی کوئی تحقیق نہیں ہو سکی۔ [2] غالباً کوئی پہاڑی علاقہ ہے۔

کی چاپ۔ مردوں اور عورتوں کا ایک دوسرے کو زور زور سے پکارنا۔ سلام کرنا اور ہنسنا بچوں کی سیٹیاں اور خوشی کی چیخیں۔ سفید پگڑیاں اور رنگ برنگی ساڑیاں۔ چم چم کرتے لال اور کالے جوتے اور مور کے پروں کی ایسی رنگین چپلیں۔ گھنی مونچھوں کے اوپر جوانی کی موتی جیسی آنکھیں۔ سیاہ بالوں کے دل میں سفید نگوں کے کلپ۔ سکون اور سنجیدگی سے بھرپور سفید داڑھیاں جھکتے ہوئے رومال، مضبوط کلائیوں اور صراحی دار گردنوں میں پہنے ہوئے گجرے ہر طرف ہنسی۔ ہر طرف رنگ، ہر طرف خوشبو، وہاں پہنچتے ہی خوشی کا نشہ چڑھتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ ساری دنیا خوشگوار موسم سے سنگت کر کے سانولی شام کی پیشوائی کے گیت گا رہی ہے۔

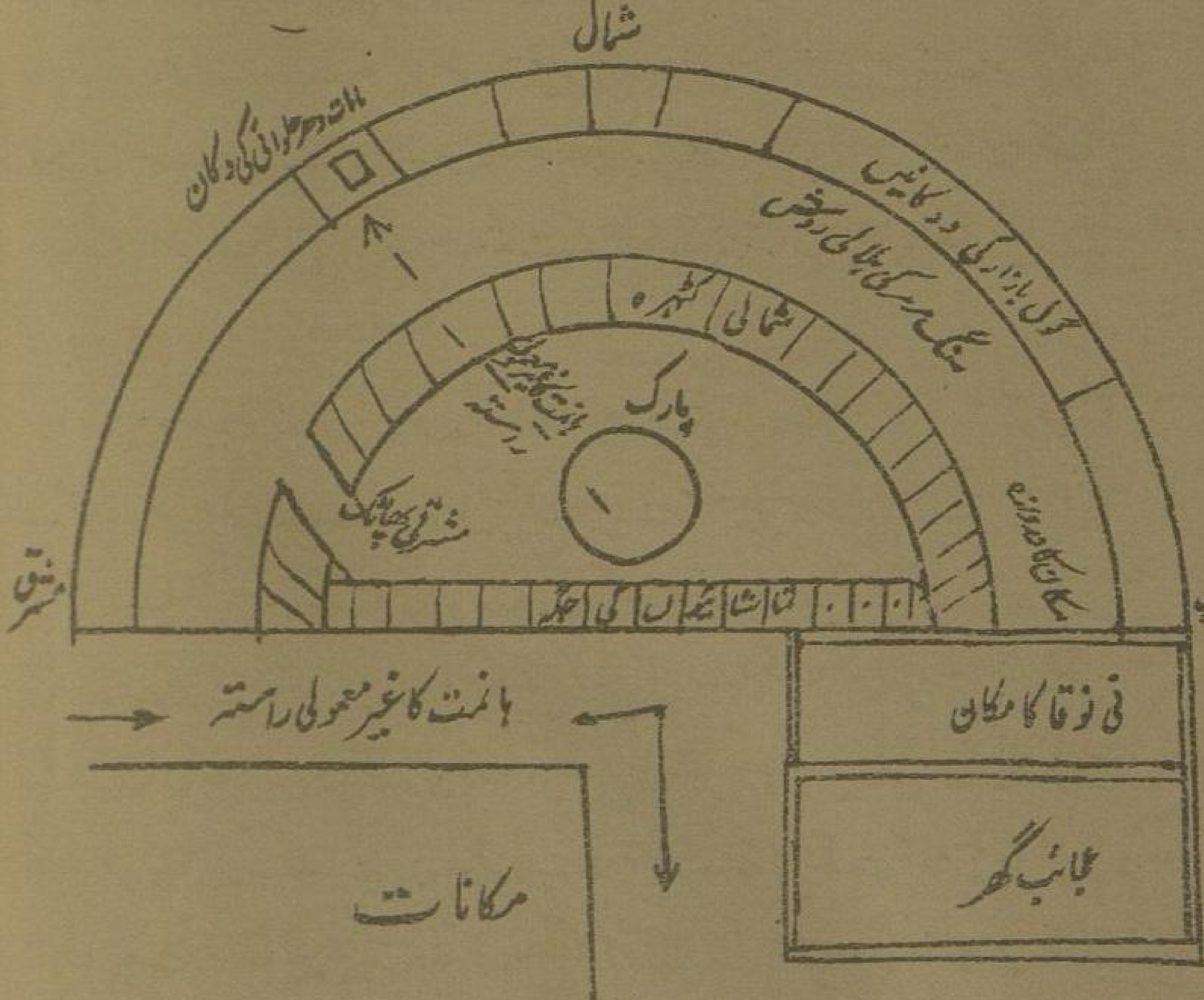
میں سنگ مرمر کی ہلالی روش پر ٹہلتا، داہنی طرف کی سجی دوکانوں اور ان کے خریداروں کو دیکھتا۔ بائیں طرف کے پارک کے پھولوں کی کیاریوں سے آنکھیں سینکتا پارک کے گرد نیم دائرہ بنا کر اس کے مشرقی پھاٹک تک پہنچ گیا۔ پارک کے اندر گیا۔ وہاں کالج کے لڑکے لڑکیاں شام منانے کو آگئی تھیں۔ لڑکے کبڈی کھیل رہے تھے اور لڑکیاں گھاس پر بیٹھی کچھ بیٹھی لیسیں بنا رہی تھیں۔ بالائی کی برف کھا رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں۔ ان سے گزر کر فوارے کے پاس بچے کھیل رہے تھے، ایک بچہ اپنے دوست کتے کو بسکٹ کھلا رہا تھا۔

یونہی ٹہلتا ہوا میں پارک کے کٹہرے کے جنوبی حصہ کی طرف جا پہنچا۔ یہاں مردوں عورتوں، جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ ہائنت کو نکلتے ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے مگر ابھی تک لوگوں کا شوق گھٹا نہیں۔ میں نے اب تک اس کو

---

۱ جہاں تک میرا خیال ہے گول بازار، پارک، عجائب گھر اور ہائنت کے ماسٹر کی یہ جغرافیہ ہوگی۔ ۲ دلی کی نذر چڑھائے

صرف دو بار دیکھا تھا۔ اس لئے جی میں آیا۔ لاؤ آج اس کی زیارت پھر کی جائے۔ میں عجائب گھر کے برابر جہاں سے ہانمت جنوب کی طرف عدالت روڈ پر مڑا کرتا تھا کھڑا ہو گیا۔ ہانمت کے آنے کا وقت آ گیا تھا۔



نیلے آسمان اور سفید عمارتوں کے پس منظر میں بارہ فٹ کا سرخ پوش ہانمت، دیو کا دیو ایک ہاتھ سے پانی کا چھکڑا گھسیٹتا، دوسرے میں پائپ لئے پانی چھڑکتا چلا آ رہا تھا۔ پاؤں

بھاری تو ہاتھی کے ایسے، مگر پھرتی ان میں تازی کتوں کی ایسی۔ سینہ کا دل جیسے ریل کے انجن کی ٹنکی مگر کمر میں چیتے کا لوچ۔ گردن جیسے توپ کی نال مگر اس میں کالے سانپ کی لہر۔ آواز جیسے بادل کی گرج، مگر اس میں چیل کی پکار کا اتار چڑھاؤ۔ اس میں شبہ نہیں کہ انجینیئر[1] نے ہامنت بنا کر مشینی ترقی کو کمال پر پہنچا دیا۔ جب انسان بنا لیا تو باقی کیا رہ گیا۔

ہامنت ایک فرلانگ پر تھا تب ہی سے اس کے پاؤں کی دھمک آنے لگی۔ دھم دھم —— دھم دھم۔ ساتھ ساتھ اس کا کڑک دار "ہٹو بچو" اور چھکڑے کی گڑگڑاہٹ۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بہت بڑی سڑک کی تیاری میں سڑک کوٹنے والا انجن لگا ہے اور سینکڑوں دھر مٹ چل رہے ہیں یا کوئی پلٹن کی پلٹن توپیں گھسیٹتی دھاوا کرتی چلی آ رہی ہے۔

جب ہامنت اپنی مرغی کے انڈوں کے برابر کی آنکھیں چکر کرتا "ہٹو بچو" چلاتا پارک کے سامنے آ گیا تو اس نے حسبِ معمول گردن گھما کر ذرا مسکرا کر ہم سب کو سلام کیا۔ اسے دیکھ کر یہ یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ یہ جھوٹ موٹ کا آدمی ہے۔ وہ پانی چھڑکتا ہوا عجائب گھر کے برابر سڑک کے موڑ تک پہنچ گیا۔ اب اسے عدالت روڈ پر جنوب کی طرف مڑنا چاہئے تھا ورنہ عجائب گھر سے ٹکرا جاتا۔ آج نہ جانے اسے کیا سوجھا کہ جنوب کے بجائے شمال کی طرف مڑ گیا۔ یعنی جدھر ہم لوگ کھڑے تھے یا پارک اور گول بازار تھا۔ وہ اسی طرح پانی چھڑکتا کٹہرے تک آ گیا۔ اس کی ایک ٹھوکر لگتے ہی کٹہرا اس طرح لیٹ گیا جیسے وہ لوہے کا نہیں سرکیوں کا بنا ہوا تھا۔ ہامنت تو نکل گیا۔ مگر جب چھکڑا گزرنے لگا تو جھکے ہوئے کٹہرے نے بڑی بے بسی سے اس کے پہیے تھام لئے۔ شاید ہامنت پر اس کا کچھ اثر ہوا اور وہ رکا۔ رکا تو نہیں۔ رکنے کا ارادہ کیا ہی

---

[1] اس جگہ جو لفظ تھا اس کے صحیح معنی کی تحقیق نہیں ہو سکی۔ میں نے صرف قیاس سے اس کا ترجمہ انجینیئر کیا ہے

تھا کہ بدل دیا۔ ایک جھٹکے میں چھکڑے کے ساتھ کٹہرا اس طرح نچا چلا آیا جیسے کٹہرا نہیں ململ کا تھان تھا۔ اس ذرا سی رکاوٹ پر ہانمت کو غصہ آگیا، اور وہ بہت زور زور سے چلانے لگا۔ اس کی "ہٹو بچو" "ہاؤ ہاؤ" ہو کر رہ گئی۔ کان پھٹے جا رہے تھے اور آس پاس کی عمارتیں تھرا رہی تھیں۔

ہانمت کو اپنی طرف آتے دیکھ کر سارے مجمع کی وہ حالت ہو گئی جو بکریوں کے گلّے کی ہوتی ہے، جب بھیڑیا حملہ کرتا ہے۔ آدمی پر آدمی گرنے لگا۔ مرد اور عورتیں چیخنے لگے، بچے رونے لگے۔ سب بدحواسی سے ادھر اُدھر بھاگنے اور ایک دوسرے کو پکارنے لگے۔ آپس میں ٹکرا کر گر پڑے اور بھاگنے والوں کی لاتوں سے کچل کچل گئے۔ دو ایک تو ایسے بدحواس ہوئے کہ سیدھے ہانمت سے جا کر ٹکرا گئے اور اُس کے پاؤں کے نیچے آ گئے۔

ہانمت فوارے کے پاس پہنچا۔ ایک آیا بچے کی گاڑی چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ وہ ہانمت کے سامنے پڑ گئی اور ایک ٹھوکر میں فٹ بال کی طرح اڑ گئی۔

اب ہانمت کی راہ میں فوارہ تھا۔ اُس نے ضرور کچھ رکاوٹ ڈالی۔ یہی کوئی آدھا سیکنڈ مگر پھر فوارے کا فوارہ معہ حوض کے زمین پر آ رہا اور ہانمت چھکڑا گھسیٹتا، گول بازار کی دوکانوں کی طرف چلا۔ اُس کا رُخ ماما ت دھر حلوائی کی طرف تھا

فوارے کی رکاوٹ سے اس کا غصہ اور بڑھ گیا تھا۔ اب وہ اتنا چیخ رہا تھا کہ طوفانوں کی گرج آکاش میں چھپ جانے والے پہاڑوں سے ٹکرا رہی ہے۔

اتنی دیر میں سارا پارک اور گول بازار خالی ہو گیا۔ صرف بکھرے ہوئے جوتے اور چپلیں اور ٹوپیاں، کٹہرے سے اٹکی ہوئی ساڑیوں اور کرتوں کی دھجیاں، چلاتے کراہتے زخمی اور کچلی ہوئی انجان لاشیں چند لمحے پہلے کی پہل پہل کی یادگار رہ گئی تھیں۔ فوارے کے پاس

کتے کو بسکٹ کھلانے والا بچہ معہ اپنے کتے کے کچل گیا تھا مگر اس کا ہاتھ اور بسکٹ ہامنت کے قدموں سے بچ گئے تھے۔ کتا جس طرح پڑا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ بچارے نے اپنے ننھے مالک کو بچانے کے لئے ہامنت پر حملہ بھی کیا تھا۔

ہامنت مامات دھر حلوائی کی دوکان تک پہونچا۔ اندر جانے سے پہلے سائبان سے اس کا سر ٹکرایا۔ سائبان پاش پاش ہو کر زمین پر آرہا۔ اتنے میں بڑے سخت دھماکے کی آواز آئی اور دوکان معہ اپنی منزلہ عالی شان عمارت کے ہامنت پر آرہی۔

۱۳ ستمبر ۲۰۰۴ء لندن صبح

رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ گول بازار کی تباہی کی تصویر آنکھوں کے سامنے اس طرح پھر رہی ہے۔ جیسے میں ابھی وہیں ہوں۔

رات ڈائری لکھنے کے بعد ایک بات اور یاد آئی۔ عجیب سی بات ہے۔ جب ہامنت نے مامات دھر کی دکان کا رُخ کیا تھا تو اس کی دکان پر جتنے خریدار تھے سب تو اپنی اپنی جان لے کر بھاگ گئے۔ مامات دھر بھاگا نہیں۔ جانتے ہو اُس نے کیا کیا؟ ایک تھال برفیوں کا اٹھایا۔ اس میں ہار پھول رکھے۔ ہاتھ میں سیندور لیا اور رام نام جپتا ہامنت کی طرف بڑھا۔ اُس کے چہرے اور آنکھوں میں کیا سکون اور بھروسہ تھا! جس نے دیکھا اُسے یقین ہو گیا کہ ہامنت ان کے پاس پہنچ کر اپنے ماتھے پر سیندور لگوا لے گا گلے میں ہار پہنے گا اور مٹھائی کا تھال لے کر واپس چلا آئے گا۔ شاید اسی لئے زحمت کی ہے۔ یا ممکن ہے کہ پہلے سے کچھ کہی بدی ہو۔

مامات دھر کا قد صرف پانچ فٹ کا تھا۔ ہامنت کے ٹیکہ لگانے کے لئے بیچارے نے سوا قدا جھکنے کا ارادہ کیا تھا۔ افسوس دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ مامات دھر کے قریب آنے سے پہلے ہی ہامنت ایک ڈگ رکھ کر سائبان کے پاس پہنچ گیا اور اس کے گرد و غبار اور

گرتی ہوئی اینٹوں اور شہتیروں نے مامات دھر اور ہانمت دونوں کو چھپا لیا۔ اللہ جانے مامات دھر کو کتنی کامیابی ہوئی۔

۱۳ ار سمبھ سنہ ۱۳۰۰۲ نند شام

سُنا اس کلجگ میں بھی ایسے لوگ ہیں جو عاقبت اندیشی کے پیچھے اپنی جان تک خطرے میں ڈال دیتے ہیں مجسٹریٹ نی نوفانے اس کی مثال بڑی بہادری سے پیش کی۔ کل جس وقت ہانمت کٹہرا توڑ کر پارک میں گھسا۔ اس وقت مجسٹریٹ صاحب اپنے مکان کی چھت پر جو عجائب گھر کے بغل میں ہے۔ تشریف فرما تھے۔ ہانمت کے کٹہرا توڑنے کا انہوں نے غور سے معائنہ کیا۔ پھر فوراً اپنے بیوی بچوں کو بلا بھیجا اور کہا کہ ہانمت نے بے راہ روی اختیار کی ہے۔ سیدھی راہ کی صرف ایک سمت ہوتی ہے لیکن بے راہ روی کی کوئی سمت نہیں۔ اس کے لئے سب سمتیں ہوتی ہیں۔ اب ہانمت کا کوئی ٹھیک نہیں کہ وہ کیا کرے گا اور کدھر جائے گا۔ اس وقت ہم لوگوں کی جان سخت خطرے میں ہے۔ نہ جانے کس وقت وہ ہمارے گھر میں گھس آئے اور ہم پر حملہ کر دے۔

بیوی نے اس پر دبی زبان سے کہا

"اوّل تو ہانمت اب دور نکل گیا ہے۔ دوسرے وُہ چھت پر کیسے آ سکے گا؟"

مجسٹریٹ صاحب اس احمقانہ خیال پر ہنسے اور بولے

"تم کیا جانو کہ بے راہ روی کتنی بُری چیز ہے۔ یہاں اس کا تجربہ کرتے زندگی بیتی ہے۔ جب کوئی راہ سے ہٹا تو پھر ہٹا۔ اب ہانمت سے یہ بھی عجب نہیں کہ وُہ صرف ہم پر حملہ کرنے کیلئے یہاں اڑ آئے۔"

پھر وُہ کہنے لگے :۔

"خیر زیادہ باتوں کا وقت نہیں۔ جو کچھ کرنا ہے جلد کرنا چاہیئے۔ ہم لوگوں کا گول بازار سے جانا سخت خطرناک ہے۔ اس لئے صرف ایک صورت رہ گئی ہے۔ وُہ یہ کہ چھت پر سے کود پڑیں اور اگر نیچے زندہ پہنچیں تو فوراً تھانے کے دامن میں پناہ لیں۔"

اس وقت سنتے ہیں کہ مجسٹریٹ صاحب کے چہرے پر وہ شان تھی جو بڑے سے بڑے فیصلے سناتے وقت بھی نہیں دیکھی گئی۔ داڑھی کا ایک ایک بال ایسا کھڑا تھا جیسے پولیس کے سپاہی پریڈ پر، اور پلکوں کے اُس پار سے آنکھیں اس آن بان سے تک رہی تھیں جیسے جیل کی سلاخوں کے باہر سے جیل کا افسر۔ کس کی مجال تھی کہ ان کے فیصلے سے سرتابی کرتا۔ سب فوراً حکم ماننے پر تیار ہو گئے۔ بہادر فی نوتا نے پہل خود کی اور بڑی بہادری سے کوٹھے پر سے نیچے کود پڑے۔ مگر افسوس اسٹرک تک پہنچتے ہی وُہ ہائمنت کی زد سے ہمیشہ کے لئے بچ گئے۔ اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اُن کے بیوی بچوں میں سے کسی نے اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ اس گندی دنیا میں بہت کم سپوت ایسے نکلتے ہیں جو اپنے بزرگوں کے مرنے کے بعد ان کے نقش قدم پر چلیں۔

بار ایسوسی ایشن میں فی نوتا کی عاقبت اندیشانہ شہادت کی خبر جب سنی گئی تو ممبران بہت متاثر ہوئے اور فوراً یہ تجویز پیش کی کہ مرحوم نے صحیح قانونی ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس پر ایک شاندار مجسمہ بنا کر عدالت عالیہ میں کھڑا کیا جائے۔ مگر صدر نے یہ تجویز یہ کہہ کر مسترد کردی کہ مرحوم کا قربانی کا فیصلہ چاہے جتنا بڑا اور ہم لوگوں کیلئے باعث تقلید ہو، لیکن اس کے عمل درآمد میں ایک قانونی کمزوری رہ گئی۔ وہ یہ کہ انہیں چاہیئے تھا کہ اپنے فیصلہ پر خود نہیں بلکہ دوسروں سے عمل کراتے۔

سنتے ہیں کہ یہ پوائنٹ صدر نے ایسا نکالا کہ اس پر سب ممبروں نے فوراً اپنی تجویز

واپس لے لی اور ایک تجویز یہ پیش کر دی کہ مجسٹریٹ فی نوقا کی جگہ صدر بار ایسوسی ایشن کا مجسمہ عدالت عالیہ پر لگایا جائے۔

۱۴ ر ستمبر سنہ ۱۴۰۰۲ ند صبح

قانونی نکتے بھی کیسے نازک ہوتے ہیں۔ ان باتوں کو کون سمجھ سکتا ہے ابھی ابھی اخبار سے ایک بڑی دردناک خبر معلوم ہوئی ہے۔ ماما ت دھر کی دکان کی اوپر والی منزلوں پر کوئی شخص ری زابا اپنے ماں باپ بھائی بہنوں اور بیوی بچوں سمیت رہتا تھا۔ ہا ئمنت کی ٹکر سے مکان جو گرا تو سب دب کر مر گئے مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ خود بچ رہا۔ صاف بچ رہا۔ نامہ نگار کا بیان ہے کہ وہ اپنے بچنے کی خوشی میں راگ رنگ کا جلسہ کرنے والا ہے۔ اسے کرنا تو چاہیئے۔

اخبار میں ان لوگوں کی فہرست چھپی ہے جو اس حادثے سے مر گئے یا زخمی ہوئے۔ بڑی لمبی فہرست ہے۔ مرنے والوں میں کچھ تو ایسے ہیں جن کی کمائی پر خاندان بھر کا پیٹ پلتا تھا افسوس! کیسا دردناک حادثہ ہوا ہے۔ ان لوگوں پر ترس آتا ہے۔ آج کتنے گھروں میں کہرام مچا ہو گا۔

۱۴ ر ستمبر سنہ ۱۴۰۰۲ ند شام

غضب ہے! اندھیر ہے! ری زابا راگ رنگ کا جلسہ نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ وہ —— کیا بتاؤں؛ ہا ئمنت کی مخالفت میں بھی نہیں بلکہ خود انجینئر کی مخالفت میں احتجاج کر رہا ہے جیسے انجینئر نے ہا ئمنت کو اسی دردناک حادثے کے لئے تو بھیجا ہی تھا اور ری زابا کے ساتھ (بری بات میں بھی کتنی کشش ہوتی ہے) اور بھی بہت سے لوگ شریک ہیں جس شخص کا بھی کوئی عزیز مارا گیا ہے۔ اس کو ری زابا نے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ کر لیا ہے۔

۱۵ ر ستمبر سنہ ۱۴۰۰۲ ند

شہر بھر کی قریب قریب سب انجمنوں نے جلسے کر کے یہ تجویز پاس

کی ہے کہ اگر حکومت ری زابا کے جلسے کو نہیں روکتی تو ہم سب اس کو زبردستی روکیں گے پبلک کو اتنا جوش ہے کہ کل بارہ بجے رات تک "انجینئر زندہ باد" اور "ری زابا پر لعنت" کے نعروں کی آوازیں آتی رہیں۔

خبر ہے کہ آج رات کو کسی وقت شہری کونسل کا اجلاس ہے اور صبح تک صدر کونسل کا کوئی بیان نکلنے والا ہے۔

۱۶ر مجھ سنہ ۲۰۱۴ ند رات

آج ہماری انجمن کا جلسہ تھا۔ شاید ہی کوئی ممبر آنے سے رہ گیا ہو۔ سارا ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ برآمدہ۔ گیلری اور صحن ہر جگہ بھیڑ لگی تھی ضعیف بڈھے، رند مشرب جوان بچے والی عورتیں، کھلنڈرے بچے سب ہی تو موجود تھے وہ ہزاروں برس کا پتھروالا ممبر جو تبرک کی طرح عبادت خانے میں رکھا رہتا ہے۔ آج خاص طور پر بڑے اہتمام سے نکال کر بیچ ہال میں رکھا گیا تھا۔ زمانے کی رگڑ سے گھسے ہوئے اسکے زینے اور اس کی برف کی ایسی ٹھنڈی سفیدی ہم لوگوں کے دلوں میں وہی اثر پیدا کررہی تھیں جو چاندنی میں گورِ غریباں کا نظارہ پیدا کرتا ہے۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا کہ دیکھا چاہئے کہ اس ری زابا کے قصّے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

جس وقت صدر صاحب صبح صادق کے چاند کی ایسی سفید پگڑی اور سفید عبا میں نورانی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے تشریف لائے تو "انجینئر زندہ باد" کا وہ شور ہوا کہ معلوم ہوتا تھا در و دیوار، محراب و منبر ہر چیز نعرے لگا رہی ہے۔ پھر فوراً ہی ایسی خاموشی چھا گئی جیسے سب طرف انسان نہیں ترشے ہوئے بت دھرے تھے۔ گود کے بچے تک خاموش تھے۔

صدر صاحب نے کھنکھار کر تقریر شروع کی۔ بتایا کہ ہمارے اوپر انجینئر کے کیا کیا احسانات ہیں۔ اس کوہستانی علاقے میں جہاں گھاس تک نہیں پیدا ہوتی اور جہاں منزلوں تک

پانی نظر نہیں آتا ہم سب اسی کا دیا کھاتے ہیں۔ اسی کا دیا پیتے ہیں اور آج ہم چلے ہیں اسی پر غرانے۔

ہم سب یہ سن کر ڈھاریں مار مار کر رونے لگے۔ خود صدر صاحب کی سفید داڑھی پر بھی آنسو باکی شبنم کے قطروں کی طرح چمک رہے تھے۔ صدر صاحب نے بتایا کہ یہی ری زابا جو آج یوں انجینئر کے خلاف اکڑتے گھومتے ہیں ان کی ماں ان کی پیدائش سے پہلے ایسی بیمار پڑی تھیں کہ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ جب وہ انجینئر[1] کے اسپتال میں جا کر رہیں تب اچھی ہوئیں۔ اگر انجینئر کی عنایت عورت پر نہ ہوتی تو آج یہ پیدا تک نہ ہوتے اور تب ان کو اپنی قدر و عافیت معلوم ہوتی۔

صدر صاحب نے بتایا کہ حکومت نے اس ری زابا کو انجینئر کے خلاف مقدمہ[2] چلانے کی اجازت دے دی ہے اور دو چار روز میں وہ منحوس دن آ جائے گا جبکہ عدالت کے ہال میں انجینئر کے خلاف گندگی اچھال کر ری زابا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا منہ کالا کرے گا۔ میرے خیال میں اس کو ایک بار سمجھانا تو چاہئے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ شاید وہ نہ جانتا ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے تمام حجت کے لئے ہم کو اپنا ایک نمائندہ بھیجنا چاہئے۔

صدر صاحب نے نائب صدر کو نمائندہ بنایا اور مجھے گواہ کی حیثیت سے ساتھ جانے کا حکم دیا اور پھر کہا کہ اگر مقدمہ چلا تو اپنی انجمن کی جانب سے میں انجینئر کی صفائی پیش کروں گا

---

[1] ممکن ہے کہ انجینئر ڈاکٹر بھی ہو یا پھر اس نے اپنے روپیہ سے کوئی اسپتال بنوایا ہوگا۔

[2] وہاں مقدمات کا دستور بالکل جداگانہ معلوم ہوتا ہے۔

خوشی کی تالیاں بجیں۔ نعرے لگے اور پھر جلسہ ختم ہو گیا۔

معلوم ہوا کہ شہر بھر کی انجمنوں نے طے کیا ہے کہ انجینئر کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے لئے اپنے اپنے نمائندے اسی طرح بھیجیں گی۔

۱۹؍ سمبھ سن ۲۰۰۲ نند رات	"چھوٹی بچی بہت تیز بخار میں بھن رہی ہے۔ پہلے اس کے لئے ڈاکٹر سے دوا لا دینا تب جانا۔"

آج ری زابا کا مقدمہ تھا۔ جیسے ہی میں گھر سے نکلنے لگا۔ بیوی نے یہ کہا۔ میں نے بھی سوچا کہ یہی مناسب ہے۔ جب باہر نکلا تو دیکھتا کیا ہوں کہ سب دکانیں بند پڑی ہیں۔ وہ مکانات جو ہر وقت ہنستے اور گاتے رہتے تھے۔ اس وقت منہ لٹکائے افسردہ کھڑے ہیں سڑکوں پر جھڑتے پتے اور ردی کاغذ اڑتے پھر رہے ہیں۔ ہر طرف ہُو گی برس رہی ہے۔ خاموشی سے سر جھکائے ہوئے آدمیوں کے غول عدالت کی طرف جا رہے ہیں۔ بس ان کے قدموں کی چاپ اور کھسر پھسر سے جو آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہی دُنیا کی آواز ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر کا پتہ کہاں ملتا۔ مجھے گھر واپس آ کر بیوی کو خبر کر دینا چاہئے تھی۔ مگر اس وقت کی رَو میں بلا سوچے سمجھے بہہ گیا۔ عدالت کی عمارت کے اندر پہنچ گیا تب ہوش آیا۔

عدالت اندر باہر ہر طرف سے اتنی بھری ہوئی تھی کہ کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ مرد عورت، بوڑھا بچہ، جوان ادھیڑ سب ہی تو جمع تھے۔ ہال کے بیچ میں ری زابا سُرخ شیروانی اور آڑی ٹوپی پہنے اپنے مریدوں کے جھرمٹ میں گھرا ہوا یوں جنچ رہا تھا جیسے شرابیوں کی محفل میں دیہاتی پتریا۔ مرید تھے کہ اس کی بے بات کی بات پر بھی ان کو ہنسی آ رہی تھی۔ ہاں اور یہ بھی بتا دوں کہ ان لوگوں نے اس ڈر سے کہ پبلک ان کی تکا بوٹی نہ کر ڈالے اپنے چاروں طرف پولیس کھڑی کر رکھی تھی۔ اتنے میں ججوں کی آمد ہوئی اور فوراً سناٹا چھا گیا۔

جیسے ججوں کا حکم ملا ری زابا نے اپنے کپڑوں کی شکنیں برابر کیں۔ حالانکہ وہاں ایک شکن بھی نہ تھی۔ پھر کھیس کاڑھ کر اپنے مریدوں کی طرف دیکھا اور بحث شروع کی۔

"حضور والا"

اس وقت اتنا سناٹا تھا کہ ججوں کے کاغذ الٹنے پلٹنے تک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ری زابا کی تقریر کیا تھی ، مجھے تو اس سے الجھن ہونے لگی۔ ذرا سی بات چھ گھنٹہ میں کہی۔ وہی بات جو وہ لوگ پہلے دن رٹ رہے ہیں کہ ہانمت کو انجینئر نے بنایا ہے۔ اسکی شکل صورت وضع قطع، چال ڈھال، بولنا چالنا، رفتار، فلاں جگہ سے چلنا فلاں جگہ سے مرجانا۔ یہ سب انجینئر نے اس میں پیدا کیا ہے۔ ہانمت میں مجال نہیں کہ اپنے میں ایک بات بھی از خود پیدا کرلے۔ چنانچہ انجینئر نے ہانمت کے بنانے کے بعد جو بیان نکالا تھا۔ اس میں یہ فقرہ تھا "کہ یہ میرے ارادے سے چلے گا اور میرے ارادے سے مڑے گا اور میرے ارادے سے باتیں کرے گا۔ میں اس سے میلوں دور رہوں گا مگر میرا ارادہ اس کے ساتھ رہیگا۔"

اس کے بعد وکیل کہنے لگا کہ ہانمت کو شہر میں چلنے پھرنے کی صرف اسی وجہ سے اجازت دی گئی تھی کہ اس کے حرکات وسکنات کا ذمہ دار انجینئر ہے اور انجینئر کے کاموں پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے

اچھا! اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ ہانمت کی بے راہ روی کا ذمہ دار انجینئر نہیں بلکہ کوئی اور مثلاً الف ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آج سے ہم کو انجینئر کی کارگیری اور اُس کے الفاظ پر کوئی بھروسہ نہ رکھنا چاہئے۔ کیونکہ ہر چیز کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اُسے الف خراب نہ کردے۔ ایسی حالت میں حکومت نے جو ہم سب کو انجینئر کے

رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ سخت غلطی کی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی چلائی ہوئی خوراک بنانے والی مشینیں[1] کل زہر بنانے لگیں۔ اس کا پہاڑوں پر بنایا ہوا آبپاشی کا بند پھٹ جائے اور ہم سب غرقاب ہو جائیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرے جواب میں کہا جائے گا کہ انجینئر نے ہانمنت کو بنایا۔ اس نے مشینری فٹ کی اور ایک انداز پر چلائی۔ یہ سب ٹھیک ہے چنانچہ ہانمنت اسی کے حکم پر چلا اور اتنے دنوں تک چلتا رہا لیکن اب جو یہ غلطی ہو گئی ہے۔ ایک ناگہانی بات ہے جس کی ذمہ داری اس پر کسی طرح نہیں آ سکتی ہے۔ یہ وہ دلیل ہے جس سے ہمارے شہر کے اخباروں کے کالم کے کالم رنگ دیئے گئے۔

سوال یہ ہے کہ انجینئر نے جب ہانمنت کو تیار کیا تو اسے اس بات کا علم تھا کہ یہ مشین بگڑ سکتی ہے؟ اور یہ کہ اگر بگڑ جائے تو اس کا کتنا خوفناک انجام ہوگا؟ اگر اسے یہ علم تھا اور پھر بھی اس نے ہانمنت کو شہر میں چلایا۔ تو پھر انجینئر کی ذمہ داری اتنی بڑھ جاتی ہے گویا تمام خوفناک حادثات اس نے خود کئے ہیں۔ اگر اسے علم نہیں تھا تو پھر ایسے شخص کو قطعی اتنا بڑا انجینئر نہ سمجھنا چاہئے کہ ہماری موت اور زندگی، بھلا برا، سب اس کے ہاتھوں میں سونپ دیا جائے۔

لوگ یہ دلیلیں سن رہے تھے اور دل ہی دل میں نفرین کر رہے تھے۔ دلیل سے ثابت کرنے کا کیا۔ کوئی مشتاق ہو تو یہ تک ثابت کر سکتا ہے کہ دن کے وقت رات اور رات کے وقت دن ہوتا ہے۔ ابھی اس کی تقریر ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ آسمان سے گرجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو بادل کا کہیں دور دور پتہ نشان نہیں تھا۔ شمالی پہاڑ گرج رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا الٰہی خیر کیجیو۔

[1] غالباً اس ملک میں سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ کیمیاوی طریقوں سے خوراک تیار کر لی جاتی ہے جس کی یہاں ابھی کوشش ہی ہو رہی ہے۔

جب واپس آیا ہوں تو لڑکی کی حالت سرسامی تھی۔ مگر میں کچھ اتنا پریشان تھا کہ اس کے پاس گیا تک نہیں۔ کیا ہونے والا ہے؟ انجینئر اور غلطی! یہ کمبخت ری زابا پاگل ہو گیا ہے ایسے ہی کچھ شکوک تھے تو ہماری انجمن کے صدر سے رفع کرا لئے ہوتے۔ وہ لو! لڑکی چلا رہی ہے۔ اولاد بھی رحمت نہیں زحمت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ دن کو چین ملے نہ رات کو نیند

۲۰ ستمبر ۱۹۴۰ء
رات

آج میری وہ حالت تھی جو گھوڑ دوڑ والے کی ہو جاتی ہے۔ جب گھوڑے منزل پر پہنچنے والے ہوں۔ راستے بھر دل دھڑک رہا تھا کہ دیکھا چاہیئے کہ آج مقدمہ کس کل بیٹھتا ہے۔ آج ہماری انجمن کا صدر وکالت کرے گا دوسری طرف یہ بھی فکر تھی کہ لڑکی کو بحرانی حالت میں چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ نجانے رات کو ملے گی یا نہیں۔

عدالت جب پہنچا ہوں تو سوائے ری زابا اور اس کے مریدوں کے سب کے ہونٹوں پر مہر لگی ہوئی تھی۔ ری زابا اپنے مریدوں سے چلا چلا کر باتیں کر رہا تھا اور وہ لوگ بات بات پر ہنسی کے مارے بیتاب ہوئے جا رہے تھے۔ بھلا اس وقت ہنسی کی کونسی بات تھی؟ کامیابی کا نشہ بھی کیا چیز ہے!

ہمارے صدر نے وکیل کی حیثیت سے کھڑے ہوتے ہی پوچھا کہ اصل مجرم یعنی ہائمت کو حاضر عدالت کیوں نہیں کیا گیا؟ اس پر عدالت نے کہا کہ وہ مجرم نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے حاضر نہیں کیا گیا[1]۔ وکیل نے اس پر کیا خوب کہا۔ کیا اس سے میں یہ سمجھوں کہ عدالت نے پہلے ہی سے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ مجرم نہیں ہے؟ یہ اعتراض اس کا ایسا چپکا کہ فوراً عدالت نے

---

[1] غالباً انجینئر عدالت کی حاضری سے مستثنیٰ ہو گا۔

ہامنت کی حاضری کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں ہامنت آیا۔ اس کے پاؤں اور کمر زنجیروں سے کسے ہوئے تھے اور پولیس کے سپاہی گھسیٹ رہے تھے۔ اس کی غلافی آنکھیں اب پہلے کی طرح چکر مکر کرنے کی بجائے نیچے جھکی ہوئی تھیں، چہرے کا رنگ ایسا اڑا ہوا تھا جیسے مر گیا ہو۔ سچ ہے کہ کیسا ہی پتھر دل کیوں نہ ہو کسے پر کچھ نہ کچھ ندامت ہوتی ہی ہے۔ مجھے حالانکہ یقین تھا کہ اصل مجرم وہی ہے مگر پھر بھی کمبخت پر ترس آ ہی گیا۔

وکیل صاحب نے سوال کیا

"مجرم کیسے آیا، کیا خود چل کر آیا ہے؟"

مخالف کے وکیل نے جواب دیا

"نہیں خود سے نہیں آیا ہے بلکہ اسے سپاہی زنجیروں سے گھسیٹ کر لائے ہیں۔"

پھر ہمارے وکیل نے پوچھا

"کیا اسی طرح ہامنت بازار میں نکلتا تھا؟"

وکیل مخالف نے جواب دیا۔

"نہیں وہاں وہ خود چلتا تھا۔"

ہمارے وکیل نے اب عدالت کو مخاطب کر کے کہا۔

"دیکھئے حضور! وکیل صاحب قبول کر رہے ہیں کہ ہامنت کی دو حرکتیں ہوتی ہیں۔ ایک غیر اختیاری جس سے وہ عدالت میں آیا ہے اور ایک اختیاری جس سے بازار میں چلتا تھا۔ وکیل مخالف کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہامنت نے جو جرم کیا ہے۔ وہ اختیاری حرکت سے کیا ہے۔ جب اس نے اختیاری حرکت سے یہ جرم کیا ہے تو پھر وہ قصوروار کیوں نہیں؟"

اس نکتہ پر وکیل مخالف کا منہ اتر آیا۔ عدالت نے بھی بہت واہ واہ کی اور پبلک کی تو حالت نہ پوچھو اس نے تو ایسے ایسے نعرے لگائے ہیں۔ اتنی تالیاں پیٹی ہیں کہ پانچ منٹ تک کوئی کارروائی ہی نہ ہو سکی۔ میں نے ہامنت کی طرف دیکھا تو اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ میں نے دل میں کہا تو اور بے قصور بنو۔

ہمارے وکیل نے عدالت سے کہا

"میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ ہامنت خود جاندار اور با ارادہ انسان ہے۔ نہیں۔ اس کی جان اور ارادہ جو کچھ ہے۔ انجینئر کا عطا کیا ہوا ہے۔ اسی کی طاقت اور ارادے سے ٹھہرتا ہے۔ بغیر اس کی مرضی کے ایک انچ بھی نہیں چل سکتا۔ مگر ساتھ ساتھ انجینئر نے اپنی اجازت سے اسے اپنے فعل کا مختار بنا دیا ہے۔ اگر شک ہو تو اس کا دماغ کھول کر دیکھ لیجیے۔ اس میں یہ بتانے کیلئے کہ کدھر شمال ہے اور کدھر جنوب، کدھر مشرق ہے اور کدھر مغرب، قطب نما بھی لگا ہوا ہے۔ مزاج کی گرمی کو اعتدال پر رکھنے کے لئے تھرمامیٹر بھی ہے۔ بے راہ روی سے بچنے کے لئے بریک بھی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر اس نے قصور کیا ہے تو اس کا ذمہ دار کون؟"

اب ہمارا وکیل کہنے لگا۔

"اگر غور کیجئے تو ہم انسان ہمیشہ سے صرف ہامنت کو ہی کو نہیں بلکہ تمام انجنوں کو جاندار اور فاعل مختار مانتے چلے آئے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں "انجن آرہا ہے" "انجن گیا" "انجن بولا" یہ تمام فقرے بتاتے ہیں کہ دل میں ہم انجن کو وہی درجہ دیتے ہیں جو ایک انسان کو۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان پر اخلاقی فیصلے بھی کرتے ہیں۔ "یہ انجن اچھا ہے"۔ "وہ انجن بُرا ہے"۔ اس کی سب سے اچھی مثال اخبار کے ایک بیان میں ملتی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ جب ہامنت بھیڑ میں گھستا اور لوگوں کو کچلتا جا رہا تھا تو عورتیں اسے کوس رہی تھیں۔ "حرامی کو موت آئے"۔ "موئے کمبخت کے پاؤں ٹوٹیں" اس کا

صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے تحت الشعور میں اسے جاندار اور فاعل مختار سمجھ رہی تھیں جب ہامنت جاندار فاعل مختار ٹھیرا اور اس پر اخلاقی فیصلے نافذ ہو سکتے ہیں تو پھر اپنے اس جرم کی سزا کیوں نہ پائے ؟"

"کہا جائے گا کہ اگر ہامنت فاعل مختار ہے تو اسکے انجینئر کا اس کے افعال میں کیا دخل ؟ یہ سوال ایک مغالطہ ہے۔ ورنہ ہامنت کے ہر فعل میں اس کا ذاتی ارادہ اور انجینئر کا ارادہ دونوں پائے جاتے ہیں۔ انجینئر چلاتا ہے، ہامنت چلتا ہے، انجینئر موڑتا ہے، ہامنت مڑتا ہے۔ انجینئر بلواتا ہے، ہامنت بولتا ہے۔"

کسی نے یہ سوال کیا

"اگر ہامنت میں ایسا ہی ارادہ ہے تو پھر وہ خود ہی اپنا انجینئر ہے۔"

وکیل نے کہا

"نہیں اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا۔ ہامنت کو اختیار و ارادہ ملا ہے مگر ایک حد تک مثلاً وہ زمین پر چل سکتا ہے مگر آسمان پر نہیں اڑ سکتا۔"

اتنا سن کر لوگوں کے دلوں پر سے ایک بوجھ سا دور ہو گیا۔ انہوں نے اتنا شور مچایا۔ بات بات پر اتنی تالیاں پیٹیں کہ میں تو تقریر بھی نہیں سن سکا۔ صرف اتنا سمجھ سکا کہ وکیل نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ انجینئر کو ہامنت کی بے راہ روی کا علم تھا تو ضرور مگر اس پر بھی انجینئر پر یہ الزام نہیں آتا ہے کہ اس نے ہامنت کو پہلے سے کیوں نہیں درست کر لیا۔

اب صدر نے عدالت سے مخاطب ہو کر کہا :-

"حضور یہ وہ عدالت ہے جو ہزاروں سال سے انسان کے دکھ سکھ، رنج و خوشی، سزا و جزا کا فیصلہ کرتی آئی ہے۔"

یہاں پہنچ کر صدر کی آواز بھرا گئی

"اس کی ابتدا ماضی کی لمبی اندھیاری رات کو چیرتی ہوئی اتنی دور نکل گئی ہے کہ آج ہماری آنکھوں سے بالکل اوجھل ہے۔ آج اسی مقدس عدالت کے سامنے ہم انصاف کی روایتوں کا اتنا قدیم ذخیرہ لئے فریادی ہیں کہ اس بے عقلی کے فتنے کو ہمارے سر سے ٹالا جائے۔"

جب ہمارا صدر تقریر کر کے بیٹھا ہے تو زبانوں پر تاثر کی مہر لگی تھی مگر آنکھوں سے شکریہ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

عدالت نے ہامنت کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا

"تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

ہامنت بالکل خاموش تھا شاید سوچ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ کون جانے اس کے دل پر کیا بیت رہی تھی مگر ماننا پڑتا ہے کہ چہرے پر بلا کا ضبط تھا۔ اس کی خاموشی پر عدالت نے ڈانٹا اور پولیس والوں نے ٹھیلا اور چونکایا۔ اب تو سورج کی ایسی چمکتی سچائی کے سامنے ہامنت نے گردن جھکالی اور پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں کی سیاہی ہی کا ہلکا سا خط جو سامنے سے دکھائی دیتا تھا، صاف دل کی سیاہی کا پتہ دے رہا تھا۔

سچ ہے کہ انصاف کی پکڑ میں دیر ہے اندھیر نہیں

پبلک کے شور اور تالیوں کے درمیان میں میں نے ری زابا اور اس کے مریدوں کے جھنڈ پر نظر ڈالی۔ ارے وہ تو اس طرح چھٹ گیا تھا جیسے مرغیوں کے غول پلی کے ملے پر۔ ری زابا تو ذرا آگے بڑھا ہوا کھڑا تھا اور اس کے ساتھی نہ جانے چپکے چپکے کدھر کسک گئے تھے۔ دو چار جو کھڑے تھے وہ بھی ری زابا سے ایسے کٹے کٹے کہ سرسری دیکھنے والے کو پتہ بھی نہیں چل سکتا تھا کہ ان کا ری زابا سے کوئی تعلق بھی ہے۔

وہ مارا اور خوش ہو! اور ہنس ہنس کر فخر کرو!

اب عدالت نے پبلک سے پوچھا کہ ہانمنت کی طرف سے کسی کو صفائی تو نہیں پیش کرنا ہے؟ ہر طرف سناٹا تھا۔ ایسے سیاہ کار مجرم کی طرف سے کون بولتا؟ اتنے میں ایک چیخ جیسی کرتی ہوئی آواز سنائی دی

"میں صفائی پیش کروں گی"۔

یہ ایک بارہ سال کی لڑکی تھی جو ایک کونے سے چلا رہی تھی۔ اس کی ماں نے فوراً اس کا منہ دبا لیا اور کہنے لگی:۔

"جی نہیں حضور یہ یونہی بکتی ہے"۔

عدالت نے کہا "ہم اسے بھی موقع دینا چاہتے ہیں کہ جو کہنا ہو کہے"۔

لڑکی دوڑ کر ہانمنت کے پاس گئی، اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگی:۔

"اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ تو بالکل نیک ہے۔ بہت اچھا ہے"۔

عدالت۔ "بس یا اور کچھ کہنا ہے"۔

لڑکی۔ "یہ بہت نیک ہے، بہت اچھا ہے"۔

بیچاری لڑکی ہانمنت کو کھلونا سمجھے ہوئے تھی۔ سب اس پر ہنس دیئے اور عدالت برخاست ہو گئی۔

اس وقت ہر طرف اتنی خوشی تھی۔ اتنا شور تھا کہ معلوم ہوتا تھا ہر شخص کی ساری مصیبتیں اک دم سے ختم ہو گئی ہیں۔ جب واپس آنے لگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ری زا بار کسی طرف سے نکل کر جا رہا ہے۔ کیا وہ ابھی تک کہیں چھپا ہوا تھا؟ اس کے چہرے پر ایسی سوگ منا رہی تھی، سر جھکائیں اور ٹیکیں اس بڑھیا کی طرح جو گئی جوانی ڈھونڈتی پھرتی ہو۔ زمین کی طرف

جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی نگاہ میرے اوپر نہیں پڑی۔ میں کھڑا دیکھتا رہا۔ آگے دھندلکا پیچھے دھندلکا اور اس طرح وہ عمارت سے نکل گیا۔

شمالی پہاڑوں کی چوٹیاں جو ہزاروں لاکھوں برسوں سے انسانی کارناموں کا مشاہدہ کرتی آئی ہیں۔ اس وقت ہلکی سیاہی کا دوپٹہ اوڑھے آسمان کی نیلاہٹ میں دور تک گھسی ہوئی صرف ایک ٹمٹماتے ستارے کی روشنی میں ہماری دنیا کو بے توجہی سے دیکھ رہی تھیں۔ ان سنگین چوٹیوں کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم انسانوں نے کیا کامیابی حاصل کی ہے۔

راستہ بھر میں یہ دیکھتا آیا کہ لوگ گھروں میں چراغاں کر رہے ہیں۔ جب اپنے گھر آیا تو وہاں بھی چراغاں نظر آیا۔ اندر آ کر یہ بھی خوشخبری سنی کہ بچی کا بخار بھی اتر گیا۔

۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ء لندن
صبح

آج اخباروں نے ری زابا پر سخت لعن طعن کی ہے۔ لیکن اسی سلسلے میں ایک عجیب بحث چھڑ گئی ہے۔ یہ تو سب مانتے ہیں کہ ری زابا نے انجینئر کی مخالفت کر کے بہت برا کیا ہے مگر اختلاف اس میں ہے کہ فعل کی برائی اس بات میں ہے کہ اس نے ایسا سوچا کیوں یا اس بات میں کہ اگر سوچا تھا تو زبان سے کیوں نکالا۔ یہ بحث اتنا طول پکڑ گئی کہ آج دو جماعتوں میں اس پر مار پیٹ ہو گئی۔ تین شخص زخمی ہوئے۔

میرے خیال میں اصل جرم اسی میں ہے کہ ایسا سوچا کیوں؟ جو بات مانی ہوئی ہے بس وہ مانی ہوئی ہے۔

یہ بھی خبر ہے کہ ابھی دو ایک انجمنوں کی طرف سے اور بحث ہو گی۔ آج انجمن کے صدر کی بحث سن کر دل پر سے بڑا بوجھ اتر گیا۔ دل تو بڑا پاپی ہوتا ہے نا۔ وہ ری زابا کے کہنے

میں کچھ نہ کچھ آگیا تھا۔ کبھی کبھی ایک کھٹک سی ہو جاتی تھی کہ اگر انجینیئر قصور وار نکلا تو ——— مگر توبہ توبہ۔ یہ کیسی بات ہے۔ آج رزی زابا کی ہریلی صورت دیکھ کر تو دل کو اتنا سکون ہوا۔ گویا جیتے جی جنت مل گئی۔

۱۲ رجب ۱۴۰۰ھ
شب

آج عدالت میں تین انجمنوں کی طرف سے وکیل پیش ہو گئے ایک وکیل نے کہا

"میں مانتا ہوں کہ ہائمنت قصور وار ہے۔ میں اسکی طرف سے صفائی پیش نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ حق کی حمایت ہو اور حق یہ کہتا ہے کہ ہائمنت کو قصور وار ٹھہرانے سے پہلے دیکھ لینا چاہیئے کہ اس میں تحریک کس کی ہے۔ اصل مجرم وہی ہے جس کی تحریک ہے۔ اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو کھل جاتا ہے کہ ساری حرکت سڑک کی ہے۔ اس کو چاہیئے تھا کہ ہائمنت کو شمال کی طرف موڑتی مگر اس نے جنوب کی طرف موڑ دیا ہائمنت بچارے کا جو کچھ قصور ہے وہ یہ کہ اس کے بہکانے میں آگیا"

دوسرے وکیل نے بھی صرف "حق" کی حمایت کے لئے ہائمنت کی صفائی پیش کی۔ کہنے لگا

"ہائمنت کو قصور وار ٹھہرانے سے پہلے دیکھ لینا چاہیئے کہ اس نے جرم کن حالات میں کیا ہے۔ وہ بہت لمبا راستہ طے کر کے تھکا ماندہ گول بازار تک آیا تھا۔ یہاں کالی آنکھیں، ہنستے ہونٹ اور رنگین تالیوں نے اس کا استقبال کیا۔ اس پر اس نے خوش ہو کر ان سب کو سلام بھی کیا۔ اسی حالت میں بڑھتا ہوا جب وہ عجائب گھر تک پہنچ گیا تو اس کے داہنی طرف سناٹا تھا اور بائیں طرف حسن و رنگ کے جھرمٹ۔ اخباروں کے بیانوں سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مڑنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر نہیں مڑا۔ کیا اس سے یہ

صاف سمجھ میں نہیں آجاتا ہے کہ اس رنگین محفل نے اپنی اداؤں سے اسے ایسا لبھا لیا کہ غریب کو شمال جنوب کی تمیز نہیں رہی۔ اب میں عدالت سے پوچھتا ہوں کہ ایسی حالت میں قصور رہامنت کا ٹھہرتا ہے، یا اس مجمع کا جس نے اسے گمراہ کیا"

تیسرے وکیل نے کہا

"میں مانتا ہوں کہ رہامنت مختار ہے اور یہ بھی مانتا ہوں کہ یہ قصور اس نے اپنی سمجھ سے کیا۔ لیکن پھر بھی میں پوچھتا ہوں کہ اس کی سمجھ میں یہ خرابی کیسے آئی؟ یہ یقینی بات ہے کہ انجینئر نے اس کو بے عیب ہی بنایا ہوگا۔ اسی سوال کے جواب میں ذرا ان مستریوں پر نظر ڈالئے جن کے ہاتھوں یہ تیار ہوا ہے، جنہوں نے اس کی آواز، اس کی چال درست کی ہے اور جو کئی سال سے اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ کیا وہ ان قصوروں کے ذمہ دار نہیں ٹھہرتے ہیں؟"

عدالت کو یہ اعتراض ایسا مناسب معلوم ہوا کہ اُس نے فوراً مستریوں کو گرفتار کر بلوا لیا

دو مستری ہانپتے کانپتے آئے۔ ڈر سے چہرے ایسے سفید جیسے دھلا کپڑا۔ آنکھیں آندھی سے پریشان چڑیوں کی طرح سہمی ہوئی۔ عدالت نے اُن کا قصور نہیں بتا کر پوچھا

"کہو تم اپنی صفائی میں کیا کہتے ہو؟"

دونوں نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا کر کہا

"حضور ہم لوگ بالکل جاہل اور ناسمجھ ہیں۔ ہم کو جیسا جیسا انجینئر کی طرف سے حکم ملتا ہے ویسا ہم کر دیتے ہیں۔ اگر اس سے ہم ذرا بھی کم و بیش کرنا چاہیں تو کر ہی نہیں سکتے ہیں۔ اس کی ہم میں اہلیت ہی نہیں ہے۔"

عدالت نے یہ عذر مان لیا

پھر مستری ہاتھ باندھ کر کہنے لگے۔

"اجازت ہو تو کہیں قصور کس کا ہے۔"

عدالت۔ "کس کا؟"

"حضور ہم نے ہامنٹ کو اپنے ہاتھوں سے تیار کیا۔ اس کے چلنے پھرنے، بولنے اور پانی چھڑکنے کی سال بھر سے نگہداشت کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ کتنا سمجھدار ہے اور اس کا ہر قدم کتنا صحیح پڑتا ہے۔ وہ کبھی اپنی مرضی سے ایسا جرم نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سارا کیا دھرا اس بیوقوف جھکڑے کا ہے، یقین مانیے کہ وہ اتنا بیوقوف ہے کہ آگا پیچھا، داہنا بایاں، کچھ نہیں جانتا ہے۔ اسی بے وقوف کی صحبت میں رہتے رہتے ہامنٹ کی ساری بدھ ماری گئی اور اس کیلئے بھی داہنا بایاں یکساں ہو گیا۔"

آج کی بحثوں پر جو اخباروں میں تبصرے ہوئے ہیں وہ بھی خوب ہیں۔ مائیں تو سب اس پر متفق ہیں کہ قصور جھکڑے کا ہے۔ ہامنٹ کو بالکل چھوڑ دینا چاہئے۔ باپوں میں سے کچھ تو ٹرک کا قصور سمجھتے ہیں اور کچھ جھکڑے کا۔

رہی بھلبھنے والی دلیل۔ اس پر گول بازار میں روز کے جمع ہونے والے تو بہت ہی ناراض ہیں۔ ان کا بس چلے تو بس وکیل نے یہ بات کہی تھی۔ اسے توپ دم کرادیں لیکن ان کے علاوہ شہر بھر کے جوانوں کے ماں باپ اس بات کو معقول بات سمجھتے ہیں اور اس پر غور کر رہے ہیں۔

۲۳ر سمجھ سنہ ۱۴۰۲ء
رات

آج بزرگوں کی انجمن کا وکیل پیش ہوا۔ اس نے کہا۔

"ہم کہتے ہیں چھت اوپر ہے، زمین نیچے۔ اسی طرح ہمارے یہاں چار سمتیں ہوتی ہیں، مشرق، مغرب، شمال، جنوب پھر ان سمتوں کے کونے اور ور کونے بھی ہیں۔"

ہم روزمرہ یہی سنتے رہتے ہیں اور سنتے سنتے سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ سمتیں واقعی ہیں۔

اگر ذرا اس نظام شمسی سے باہر نکل کر اپنی دنیا پر نگاہ ڈالئے تو اوپر نیچے کیا ہوگا۔ کون حصہ اوپر ہوگا کون نیچے؟ کون مشرق ہوگا اور کون مغرب؟ ہم ذرا بھی اپنا تخیل بڑھا دیں تو معلوم ہو جائے گا کہ سب فرضی چیزیں ہیں۔ اوپر، نیچے، مشرق، مغرب، یہ کچھ نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ یا تو ہر سمت ایک سمت ہے یا کوئی سمت کوئی سمت نہیں ہے۔"

"اس حقیقت کے جاننے کے بعد یہ سوال ہی فضول ہو جاتا ہے کہ ہامنت داہنی طرف کے بجائے بائیں طرف کیوں مڑ گیا۔ داہنی طرف اور بائیں طرف کیا؟ اسے مڑنا تھا مڑ گیا، بلکہ اگر وسیع نظر سے دیکھو تو مڑنا ہی کوئی چیز نہیں۔ اسے حرکت کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ حرکت کرتا رہا اور اگر اس سے بھی وسیع نظر سے دیکھو۔ وہ وسیع نظر جہاں پہنچ کر کائنات کی سرحدیں ٹوٹ جاتی ہیں جہاں پہنچ کر فنا و بقا کا سنگم بنتا ہے تو صاف نظر آئے گا کہ حرکت و سکون بھی کوئی چیز نہیں ہیں ہامنت کو ایک حکم ملا تھا وہ اسے انجام دیتا رہا۔ جب حرکت نفس الامر میں کوئی چیز نہیں تو یہ سوال کہ ہامنت ادھر کیوں مڑا، ادھر کیوں نہیں مڑا۔ بالکل فضول اور بیکار ہے۔"

اس لئے ہمارا خیال یہ ہے کہ ہامنت کو سزا دینا کہ وہ جنوب کی طرف کیوں مڑا۔ یا چھکڑے کو سزا دینا کہ اس نے ہامنت کو کیوں بے راہ کیا ایک فضول سی بات ہے۔ لیکن اگر سزا دے بھی دی جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کی مخالفت کرنا بھی ایک فضول سی بات ہے۔ کیونکہ ہم جرم کے تصور سے بے جرمی اور بے جرمی سے جرم کو پہچانتے ہیں جب جرم نہیں رہا تو بے جرمی بھی نہ رہی اور جب یہ دونوں نہیں تو سزا و جزا بھی نہیں انسان کسی حالت میں بھی ہو۔ نہ اس کو سزا کی حاجت کہہ سکتے ہیں نہ جزا کی۔

ان دلیلوں پر لوگ بے طرح واہ واہ کر رہے تھے۔ بعض تو اس طرح جھوم رہے تھے

جیسے بین پر سانپ، اور عدالت تو ایسی بے خود ہوئی کہ حالانکہ صریحاً اصول کی خلاف ورزی تھی مگر اس نے اسی وقت وعدہ کر لیا کہ ہم آپ کی رائے پر ضرور عمل کریں گے

اس کے بعد اور وکیل آئے مگر وہ کہی ہوئی باتوں کو الٹ پھیر کر کہتے رہے

عدالت برخاست ہو جانے کے بعد لوگوں میں پھر وہی تشویش پھیل گئی جو پہلے دن تھی کہ نجانے عدالت کا فیصلہ کیا ہو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اندر سے کوئی کہہ رہا ہو کہ سزا ہامنت ہی کو ملے گی۔ لیکن اگر۔ . . . نہیں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ توبہ! توبہ!!

دو گھپ سنہ ۱۴۰۰ سہ نند سہ پہر

ہامنت کو پھانسی ہو گئی۔ اسے پابہ زنجیر پھانسی گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے کے لئے سارا شہر سڑکوں پر امنڈ آیا تھا بچے بوڑھے، سرخ چمکیلے کپڑے پہنے سیٹیاں بجاتے، غبارے اڑاتے، اپنے باپ دادوں کے کندھوں پر سوار تھے۔ عورتوں کے غول کے غول رنگین کپڑے پہنے، گلوں میں ہار ڈالے گاتے ادھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر جا رہے تھے۔ کھلونے والے، خوانچے والے صدائیں دیتے گھوم رہے تھے۔ بالکل یہی معلوم ہوتا تھا کہ عید کا میلہ ہے۔

جب ہامنت ان لوگوں کے بیچ سے گذر رہا تھا تو اس پر ہر طرف سے گالیوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ سڑے گلے پھل، گندے انڈے اور کیچڑ کے لوندے اتنے پھینکے گئے اتنے پھینکے گئے کہ ساری سڑک گندی ہو گئی اور واپسی میں ہر ایک کے کپڑے خراب ہو گئے۔

عدالت کے انصاف کی ہر شخص تعریف کر رہا تھا اور ہر شخص خوش تھا۔ اگر کسی کو افسوس تھا تو اس بارہ برس کی لڑکی کو جو اس دن ہامنت کی طرفداری کرنے آئی تھی آج تو جسے دیکھو لڑکی کی ماں کو نصیحت کر رہا تھا کہ اس لڑکی کے چال چلن بگڑ رہے ہیں

ابھی سے دبا دبا کر ٹھیک کر لو۔

ایسے ہی لوگ بڑے ہو کر ری زابا بنتے ہیں۔ ان کی پیدائش ہی بند ہو جاتی تو کیسا اچھا ہوتا۔

طویل افسانہ

آخری کوشش

آخری کوشش

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا

"ٹکٹ؟"

گھسیٹے نے گھگھیا کر بابو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ماں کی گالی دے کر اُسے پھاٹک کے باہر دھکیل دیا۔ ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں اور کیا ہی کیا جاسکتا ہے؟"

گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سنیں، ٹھوکریں سہیں، بیسیوں بار ریل سے اتارا گیا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے تک پیدل بھی چلنا پڑا، ایک دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے کیا؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے —— وطن! پچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے۔ جب میں کلکتہ پہنچا ہوں تو کالی

مل کھلی تھی اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آ گئے وطن۔ ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔ اگر یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو دو کوس کا کچا راستہ اور ـــــ دو گھنٹہ کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تھی یا دکانوں کے تختے، یا پھر شہر سے میلوں دور ٹھیکیدار کی جھونپڑیاں۔ جگی زمین پر اتنے آدمی ہوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی جگہ نہ ملتی تھی۔ رہے اپنے لوگ سو وہاں اپنا کون تھا؟ سب غرض کے بندے۔ بے ایمان۔ حرامزادے۔ ایک وہ سالا تھا بھوندو۔ اور وہ دوسرا اندھا بھورا اور وہ ڈائن بھنگوری جو خوبچے کی ساری آمدنی کھا گئی۔ وہ ملوں کے مزدور۔ بھائی ہیں بھائی ہیں۔ مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور سفارش لئے موجود۔ یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟ ـــــ جب جابر نے آکر مجھے حکم سنایا ہے کہ "تیری میعاد ختم" تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔ بس اکدم سے گھر کی یاد آئی۔ گھر! کیا چیز ہے!

گھسیٹے کے دل کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی سکھ مل جائیگا اور گھر اب قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آ کر گھسیٹے بھونچکا سا رہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اڑا رہی تھی۔ جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں۔ کچی سڑک کی جگہ اب پکی سڑک تھی اور اس کے برابر برابر مل تک ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ سڑک خوب آباد تھی۔ مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آ جا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فراٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک

مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔ غرضیکہ جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا۔ لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اتر کر، اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھوں۔ یہ آپ ہی آپ ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور آ کر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں اور اونکھ کے کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ آ گیا۔ تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک ہے

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبہ کے تاڑ دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں سے منڈھا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلم زمین پر لیٹا کائی کی مخملی چادر اوڑھے تھا اس پر نظر پڑنا تھی کہ بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں پچیس برس کے بھاری بوجھ کے نیچے سے اکدم پھڑپھڑا کر، تڑپ کر نکل آئیں اور کمسن دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اچکنے کودنے لگیں۔ وہ زمانے آنکھوں کے سامنے پھر گئے جب اس مسجد کے گرد برساتی پانی بھر جاتا اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے نہاتے تھے۔

اس وقت بھی یہ کھڑا مینار یونہی کھڑا تھا اور لیٹا مینار یونہی لیٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہیرا، الفاقی، بلاقی، پینو، نیولا، سورج بلی اور وہ کنو اسالا کیا نام تھا اس کا، اور کون کون، ساری کی ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن دن بھر سیپارہ مار ڈنڈا اڑا کرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار امرود کا باغ تھا۔ اس پر کبھی کبھی لونڈا اڑاکا پڑا کرتا تھا۔ لونڈے گھس گئے اور چپکے چپکے کچے پکے امرود نوچ نوچ جیبوں میں بھرنے لگے اور رکھوالا ماں بہن کی سناتا دوڑا اور ادھر آناً فاناً میں سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر سے

ایک فقیرنی آنکلی جو منمنا منمنا کر گا رہی تھی۔ کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت۔ وہ چڑیل چڑیل چلا کر بھاگے۔ پھر کیا تھا سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بلاتی رہ گیا۔ ارے ڈر کے مارے اس کی گھگھی بندھی ہے اور وہ جو لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے ۔ ۔ ۔ ۔

گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا۔

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملائمت آ گئی تھی اور ہواؤں میں خوشگوار خنکی۔ راستے کے ایک طرف سرپتاور کے ہرے بھرے جھنڈ تھے جن کے بیچ بیچ سے بوڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بسیرا لینے والی مینّاؤں اور کووں کا شور، کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں، ہلواہوں کی ہٹ ہٹ، باغوں کے رکھوالوں کی ہو ہو۔ ان سب سے ہوا اسی طرح بسی ہوئی تھی جیسے پتاوروں کی بھینی بھینی میٹھی خوشبو سے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت، درخت، ہوا، آنے والی صدائیں اور خوشبوئیں سب قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا۔ آگے آگے ایک لڑکی پھٹی اوڑھنی سے سر لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہلوں کو کندھوں پر رکھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے۔ ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

ادھر سورج افق کے دامن میں چھپا اور ادھر قصبہ آگیا۔ اس کا نشان ایک اگلی کھڑ تاڑ تھا جس سے کچھ دور ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام سے ایک بہت رومان بھری یاد انگڑائی لیکر اُٹھی اور گھسیٹے کے پاؤں تھام لئے۔ وہ بلا ارادہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سامنے کی جھاڑی اور گڑھیا یہیں دلاری سے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی ہنا، ایسی دلاری، جس کے نہ روٹھنے کا ٹھیک اور نہ ملنے کا۔ جب وہاں بیٹھ کر دلاری کا انتظار کرتا تھا تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے! شہر جاؤں گا، نوکری کروں گا۔ دونوں وقت چنے چباؤں گا، مگر روپیہ جوڑ جوڑ رکھوں گا۔ پھر جب ڈھائی سو روپیہ ہو جائیگا تو واپس آؤں گا اور ہیرالال کی طرح اکدم سے ایک گوئی بیل لے کر کھیتی شروع کر دوں گا۔ اس وقت دلاری میری کتنی خوشامدیں کرے گی! میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلنے آجایا کروں گا۔ وہ آئے گی ضرور اور وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ، گڑھیا میں ڈھیلے پھینکے گی، گنگنائے گی، میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسے گی ——

بڑی چڑیل تھی۔ نہ جانے اب کہاں ہے؟

گھسیٹے درختوں کے اندر گھس کر دیکھنے لگا کہ پرانی گڑھیا اب تک ہے؟ ہاں ہے تو۔ اور وہ سامنے جمنی کا درخت بھی ہے جس کی جڑ پر وہ بیٹھتی تھی۔ کیا زمانہ تھا!

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آگیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے۔ ایکا ایکی ایک موڑ پر چونک پڑا۔ جیسے کوئی بسری بات اکدم یاد آگئی ہو۔ یہی جگہ تو ہے ہاں یہیں ابا نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شبن میاں کی قمیص کا بٹن نوچ لیا تھا

ادھر شبن میاں گھر کے اندر آئے اور اُدھر ڈانٹ لگائی "گھسیٹے گھسیٹے ——— کدھر گیا" ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دیتے۔ "ان کو اتارو، پھر جرابیں اتارو، پھر انگلیوں کو تولئے سے پونچھو، پھر جوتی لا کر پاؤں کے نیچے دھرو ——— شبن میاں کی چیزیں!! دیکھ دیکھ کر کتنا جی چاہتا تھا کہ ان میں سے دو ایک ہمارے پاس بھی ہوں۔ ہمارے پاس کیا تھا؟ ایک پھٹا کرتہ پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خاں صاحب پھر کسی کا پرانا دھرانا جوڑا اوڑھا دیتے۔ "پھر پھاڑ لایا؟" "اس کے بدن پر تو کانٹے ہیں۔" "یہ کہاں سے کھونچا لگا لایا؟" "کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی" ایک بار شبن میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیص کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے چم چم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیا۔ تھوڑی دیر میں شبن میاں چلانے لگے۔ "ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟" میں نے جی میں کہا۔ میں لایا ہوں۔ کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو نہ دوں گا چاہے کچھ کر دو۔ بلکہ اب تو تمہارے گھر کام بھی نہ کروں گا سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔ میری قمیص میں آستین کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور زنجیر دونوں چیزیں باہر چم چم کریں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آ گئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں؟ گاؤں میں ادھر اُدھر دبکتا پھرتا تھا کہ ابا نے جو میری کھوج میں لگے تھے دیکھ لیا۔ "تو شبن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا۔ سونے کا بٹن" دو تھپڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا بٹن! کلکتہ میں چار چار پیسے پتہ ملتا ہے جتنے چاہو اتنے لے لو۔

چھپروں اور نیچی نیچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت چھا گئی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی جس سے دل کو عجیب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولھے جل گئے تھے جن کا دھواں اور

سُرخی چھپریوں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کو لئے بھاگی جا رہی تھیں۔ دوار سے پرے لڑکے لڑکیاں اونچا نیچا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے جیسے بسیرا لیتے وقت جنگلی بلبلائیں۔ ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کر کے ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے ہنہنا رہا تھا۔

آخر مسجد آ گئی۔ اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ پہلی تاریخوں کا ہلال مسجد کے ایک مینار سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بارات یاد آ گئی جو باجے گاجے لئے مشعلیں جلائے ایک کمزور سی ناؤ پر چڑھی گنگا کی خونی لہروں کو پار کر کے کنارے آ اتری تھی۔

بگیا بھی آ گئی۔ اس کے پار آبادی سے ذرا نکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل امید و بیم سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پوتا چھپر۔ دو بڑی بڑی اناج کی کٹھیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اٹھ کر اماں کا گھرڑ گھرڑ چکی پیسنا اور اس پر گانا "موری چھاگل نہ بولے" دن کو کام کاج کر کے گھر آؤ اور لاکھ چلاؤ "اماں روٹی دے۔ اماں روٹی دے"۔ اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ۔ رو دھو کچھ کرو، اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہیں جب اس کا جی چاہتا تب اٹھ کر چولھا جلاتی۔ جمیا اور شبراتی! اُفوہ دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی اور تھیں وہ بھی دونوں بڑی ہی حرامزادی۔ کبھی جو کام آتیں ۔۔۔۔۔۔ اور ادھر ابا کھاٹ ہی کے کنارے پر رکھے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصہ آیا اور چھوٹتے پکڑ کر دھوئیں دھوئیں ۔۔۔۔۔۔ واہ ری اماں! جہاں کبھی کا جی خراب ہوا اس کے جی کو

لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے کہ " ارے ادھر آ تیرا سر داب دوں ۔" "ادھر آ نجر گجرا تار دوں۔" چاندنی میں بیٹھ کر ٹھ کھا۔" "دونوں وقت ملتے نہ چلا۔" ہر وقت ٹکا ٹکا نار رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی ہے ـــــ کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچے پکے ، گلے سڑے ، کھٹے میٹھے جیسے بھی آم مل جائیں۔ بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔ کچے پکے امرود جھربیریاں کیتھے اور کیا کیا سب بہت شوق سے کھاتی تھی مگر بچوں کا کھانا اسے بُرا نہیں لگتا تھا۔ وہ قصہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی۔ اُس نے طاق پر رکھدی میں ادھر سے آؤں چرا کے ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ ادھر سے آؤں چرا کے ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ شام کو ابا نے جو دیکھا تو ذرا سا گڑ تھا وہ لگے ڈکارنے " کون کھا گیا ؟" اماں سمجھ گئیں۔ سہولیت سے بولیں " چوہا کھا گیا ہوگا۔" تو کھا گئی ہے تُو۔ کیا چوہے بلی گڑ کھاتے ہیں ۔" اماں نے کہا " کیوں ؟ کیا ان کے جان نہیں ہے ۔" میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک پاری بھی لاؤں گا۔ تب تو یہی ابا چٹخارے ماریں گے " واہ کیا مجا ہے ۔" جمیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا تکیں گی منہ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون کون ہو گا ؟ ابا اماں بھلا کیا زندہ ہوں گے۔ ستر اسی برس کون جیتا ہے ؟ جمیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ ہاں فقیرا تو جوان ہو گا۔ بھورے کے تو بیوی بچے ہوں گے اور بکریاں ؟ اوہ کلو کے ناتنوں کی بھی ناتنیں ہوں گی۔ کلو زندہ ہو تو پہچانے گی ؟ جب بھوکی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کیسا میں میں کرتی۔

(۲)

سامنے گھر ہے کہ نہیں ؟ بغیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر

بڑی بیتابی سے پوچھا ــــ وُہ جگہ تھی وہ ــــ ہاں ــــ وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصّہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر تھا۔ آدھا جو کھڑا تھا اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھما تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔ چھپر کے سامنے کی طرف چوحدی کی جگہ جھانکڑوں تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جلا ایک ازدحام تھا جن کے پتلے پتلے ٹیڑھے بیڑھے سائے کیچوؤں اور کنکھجوروں کی طرح زمین پر بجبجا رہے تھے۔ گھر اپنے سناٹے میں قبرستان تھا۔ اندر نہ چولھا جل رہا تھا نہ چراغ۔ گھر کی ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں ــــ تم کو کیا کھلائیں گے۔

یہی گھر تھا جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔ گھیسٹے کی امیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے پچیس برسوں کے کچلے ارمانوں کے خون سے سینچ رہا تھا۔ اکبارگی مرجھا گیا۔ اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہوگا۔ وُہ لوگ کہیں اور اُٹھ گئے ہوں گے اور بار بار بکریوں کے موت کی کھراہند اور نابدان کی سڑاہند جو بوجھل ہوا سے دبی ہوئی گھر کے گرد مقید تھیں، ان بالوں کے گھروندوں کو ڈھا دیتیں گھسیٹے آدھ گھنٹے تک جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں پر ایک پلّا رو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی لو رہ یہ کھکھارا۔ جواب نہ ملنے پر پھر کھکھارا۔ بار بار کھکھارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا :۔

"اندر چلی آؤ نا"
اس دھوکے سے گھسیٹے کی ہمت اور بڑھ گئی۔ اب کی وہ سہارا لینے کو بیچ دکھا۔ پھر کہنے لگا۔

"کون، فقیرا؟"

"ہاں"

فقیرا ذرا چڑھ کر بولا

"تم کون ہو؟"

"ذرا ادھر آؤ"

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا

"تم ہو کون؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ذرا سنو تو بھائی، تم فقیرا ہو نا؟"

"ہاں —— کہہ تو دیا"

"تم یہیں رہتے ہو؟"

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ تو غائب ہو گیا، مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون شخص ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہنچوائے۔ اسے خیال تک نہ آیا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہوگا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا۔

"میں بائیس روز کا سفر کر کے آ رہا ہوں —— تمہارے پاس"

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

"تو اندر آؤ"

اندر آ کر گھسیٹے کی ہمت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی اُمید بھی بلا وجہ ہر یانے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچکر چراغ جلایا۔ چھپر کے نیچے سات بکریاں اور بکریوں کے بچے بندھے تھے۔ انہیں سے شاید گھر انے کی روٹی چلتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ کر زمین پر ایک چھیدھا ٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہو مگر اب چیتھڑا ہو کر گمنام ہو گئی تھی۔ اوڑھنے کیلئے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دبلا پتلا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھردری اور اُس پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھریاں، جیسے کچی دیوار پر برکھا میں پانی بہنے کی لکیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا۔ مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اُس سے زیادہ جوان تھا

گھسیٹے اُس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا

"بھیا تم تو جوانی ہی میں بڑھا گئے"

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:-

"جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے"

"سچ ہے بھیا، بھورا، جمیا اور شیراتن کہاں ہیں؟"

اب فقیرا ٹھٹکا

"پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو، گھسیٹے تو نہیں ہو؟"

"ہاں گھسیٹے ہیں اور کون بائیس دن ٹھوکریں کھا کر آ رہا ہوں"

بھیّا کہکر فقیرا اُس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچکر لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے، اس کے آنسو ڈھل ڈھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ "اب نہ رو یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آ گئے ــــــ اماں کو دیکھو گے"

گھسیٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں

"اماں!! ــــــ ہے کیا؟"

"ہاں"

چھپر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اُس کی طرف اُنگلی اُٹھا کر بولا

"وہ پڑی ہے۔"

گھسیٹے محبّت اور اشتیاق کے جوش میں ادھر بھاگا۔

یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ سر کے بال بیمار بکری کی دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑ کر نمدے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں دھول میں سونڈی کوڑیوں کی طرح بے رنگ، اپنے ویران حلقوں میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ ان کے کونے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔ گال کی جگہ ایک پتلی سی کھال رہ گئی تھی جو دانتوں کے غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے نیچے آ گئی تھی۔ گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا، بدگوشت ہو یا ورم، جیسے روتے روتے ورم آ گیا ہو۔ گردن اتنی سوکھی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آ رہی تھی ننگے سینے پر چھاتیاں لٹک رہی تھیں جیسے بھینچی ہوئی اُلٹی بنڈی کی خالی جیبیں۔ چہرے کی ایک ایک جھری سخت گھناؤنی مصیبتوں کی مہر تھی

جسے دیکھ کر بے اختیار ڈھاریں مار مار رونے کو جی چاہتا تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لے جانے لگی جیسے گونگا کھانا مانگے بڑھیا معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آتا تھا "باب...... باب... باب... باب... باب... باب...."

اُس کی آواز ایسی ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھی۔ جہاں کے رہنے والے آگ سے جل مرے تھے اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کو بندر چیختے اور رات کو سیار روتے ہیں

فقیرا نے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا۔ منہ سے نکل نکل پڑتا ہے۔ پھر بھی مانگے جاتی ہے۔"

آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا

"اماں!!"

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا تھا

فقیرا "نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی۔ بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔"

بڑھیا کا پوپلا منہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، باب کی آواز نکل رہی تھی اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا مگر ان حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دوپہر تک مسلسل چکّی

پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے،
اُس نے کیسا کیسا اپنا جی مارا! ذرا ذرا سی چیز کے لئے کیسا کیسا ترستی رہی!
گھسیٹے کے دل میں ماں کے لئے ترس بھرا پیار اُبل پڑا۔ وہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر بہو دعا
مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر۔ اور اب تو اسے ناپاک دُنیا سے اُٹھا لے،
اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اُسے سکون مل جاتا مگر افسوس آنسوؤں جیسی
نعمت کوسوں دور تھی

فقیرا کے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اُس نے کہا
"بھیا! تم ذرا ہاتھ منہ دھو لو۔ میں کھانے پینے کا کچھ سبیتا کروں"۔
فقیرا بھاگتا ہوا بنیا کے اس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا ادھار
مانگ لایا اور پھر چولھا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی جلا کر روٹیاں پکانے
بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولھے کے پاس آ بیٹھا اور بولا
"اتنا آٹا، کیا تم نے ابھی نہیں کھایا"!
"نہیں، آج آٹا ختم ہو گیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یوں ہی سہی"۔
"اب کھیتی نہیں ہوتی؟"
"وہ کب کی بند ہو گئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہو گئی میں اکیلا رہ
گیا۔ دو برس تک ترکاریاں ورکاریاں بوئیں مگر وہ بکیں بکائیں نہیں۔ لگان تک نہیں ادا ہوا"
بھورے کا سے میں پکڑا گیا"۔
"سوفی چند کی ایک بکری بیچ لی تھی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اُس کی
بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہو گیا مگر اس کی طرف سے کوئی

گاہے کو کھڑا ہوتا ہے' وہ بہنے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا۔ "فقیرا مجھ سے تو اب تیری طرح نہ بھوکوں مرا جائیگا اور نہ اس گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلا سے جیل ہو جائے چار دن 'عیش' تو کریں گے ...... دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا ......
بلکے کہتا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔"

"جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

جمیا حرامزادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں میں بیاہ ہو گیا ہے۔ ایک امرود کا باغ ہے۔ کسی طرح گذر بسر ہو جاتی ہے مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی"
ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر فقیرا روٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا:۔
"تمہارے جانے کے بعد بھیا وہ وہ آفتیں آئیں سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا زمانا تھا۔ ابا کہا کرتے تھے کہ "یہ سب پیٹ بھرے ہیں پیٹ بھرے" سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گذری جب چولھا نہ جلا ہو۔"
گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا اور اپلے کے کونوں کی طرف اس طرح تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈھ رہا ہو۔

فقیرا نے اس سناٹے کو توڑا

"کہاں کہاں رہے گھسیٹے؟"

"ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ بچے۔ گھر یاد کر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گذری وہاں۔ ملوں کی خاک چھانی۔ امیدواری میں کام کیا۔ بھوت گھر میں روئی دھونی۔ ہفتوں قبض رہتا تھا۔ چار سال رکشا چلائی۔ پھر خونچہ لگایا۔ ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے

کو ذرا پیسہ ہو اس کے لئے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے دیسوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو روٹے رلائی نہیں آتی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پر رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کھانے لگے فقیرا بولا

"بھیا ذرا چپکے چپکے کھاؤ۔ اماں سُن لے گی تو چلّا چلّا کر رات بھر نہ سونے دیگی"۔

گھسیٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا

"تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی"!

"ہاں، مگر نجانے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سن لیتی ہے اور کھانے کی بو بھی پالیتی ہے اور پھر باب، باب کرنے لگتی ہے۔

گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرف تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منہ کا نوالا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اتار سکا۔

(۳)

گھسیٹے گھر کے دوارے ہونٹوں پر پکری کا مسکلا ملے، دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا، اپنے میلے کرتے کے چلوے چن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں پیروں اور ہونٹوں کو چٹخا دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے، جن میں سینکڑوں میل کا گرد و غبار بھرا تھا جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتے پھڑپھڑاتے تھے جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو للّلہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چادروں کو بدن پر سمیٹے، ہاتھ پاؤں سکیڑے کندھوں کو آگے جھکائے سُو سُو کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اُجاڑ اجاڑ تھی، اور ہر چیز

اتنی دکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن سے وہ ٹوٹے پھوٹے ویران چھپر، بکریوں کے موت کی کھراہند اور اپنی ماں کی باب باب سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلانا اور بکریاں چرانا اور رات کو برے کی روکھی سوکھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو بھی فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی! افوہ! بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کہو یا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک۔ سب سے بڑی کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھسیٹے کو یہاں کی کسی چیز سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں روکھی پھیکی۔ گاؤں کی عورتوں میں شرم اور کھچاؤ۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانیدار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے اور فقیرا، وہ تو بات بات میں باپ بنتا ہے۔ سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں دمڑی دمڑی کے لئے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔

گھسیٹے چلو بے مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ دوکانوں کے تختوں پہ رات کاٹنا۔ وہ سڑکوں پر جاڑوں میں برف کی سل اور گرمیوں میں دہکتا ہوا توا ہوتی تھیں خچر کی طرح رکشا لیکر دوڑنا۔ وہ کبھی کبھی تین تین چار چار فاقے کر لینا اپنے گھر کی اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والی "سنگل چا" وہ دھیلے پان کا بیڑا! وہ پیسے کی ۲۵ بیڑیاں! یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لئے یہاں وہ ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے مٹر کے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کی اور بجمانوں کی مار کھائی! کھانے پینے کو ترستے رہے۔ پھر ہمت کر کے کمانے کھانے

کے اپنے شہر بھاگے۔ وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں۔ کہا چلو کلکتہ چلو۔ وہاں پہنچتے ہی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا۔ کلکتہ کے پچیس برس! اُفوہ۔ کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ رکشا تک چلائی۔ سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو جمانتی لاؤ۔ میں کیسے لاتا؟ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ گھرانے کے گھرانے رہتے تھے۔ جمانتی لے آتے تھے۔ چھمن بولا دو آنے روز دو تو کلوٹا بہاری جمانتی ہو جائیگا۔ دو آنے روز اسے دیئے۔ پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اسے دور ہی سے دیکھ کر لوگ ہٹ جاتے تھے۔ جب سیٹھ سے خوشامد کرو کہ ایک اچھی سی گاڑی دے دو تو وہ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جمع کراؤ نا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑ سے مگر رہے وہی موچی کے موچی۔ بخار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ اسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئے۔ اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا اب خبردار رکشا نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض ادھار کر کے پان سگریٹ، دیا سلائی کا خونچہ لگایا۔ اب جو آتا کہتا، سیزر لاؤ، نیبی کٹ لاؤ، یہ لاؤ وہ لاؤ۔ یہاں کیا تھا۔ کہتے "نہیں ہے صاحب، نہیں ہے حضور"، وہ بھی تماشا کچھ دنوں تک رہا۔ نہ تو بیٹھنے کو اچھی جگہ تھی نہ اچھا سامان تھا۔ اس پہ جو کچھ بھی آیا حرامزادی بھنگوی کھا گئی نجانے مجھ سالے کو عورت رکھنے کی کیا پڑی تھی .... لنگوٹی میں پھاگ ......

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقیرا سامنے سے آیا اور آتے ہی کرخت پن سے بولا۔

"پھر تم نے چرا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمہارا گزارا نہیں ہو سکتا۔ جہاں جانا ہو، چلے جاؤ۔"

گھسیٹے نے جواب دیا "کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ روز کا یہی نقصہ، روز کا یہی قصہ۔ بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔ جیسے گھر میں میرا حصّہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصّہ ہی نہیں۔"

"گھر میں حصّہ! بکریوں میں حصّہ۔ تو حصّہ بٹائے گا؟ نہ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے، گیا تھا روپیہ کمانے!"

گھسیٹے گرم ہو کر بولا:۔

"کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؟ تو خود تو زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کیلئے تکڑم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ کھو کر سیکھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کہ آپ ہی آپ؟"

فقیرا نے طعن سے کہا

"ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں۔ روپیہ کے ڈھیر تو لیکر جاتے ہی ہیں۔ بُلّی جو اتنا روپیہ لایا ہے کیسے لایا ہے؟"

اب تو گھسیٹے تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سُن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں رہ کر کچھ نہیں کیا بالکل ہی نہیں سن سکتا تھا۔ وہ چلّا کر بولا۔

" اور تو نے کیا کر لیا ہے، چوٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں، اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا؟ سب کا سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے۔ میں آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا! . . . . . ."

گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے۔ کیا کرے

جو فقیرا کو یقین دلا دے کہ کلکتے میں میں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔

کچھ دیر یوں ہی تو تو میں میں ہوتی رہی پھر فقیرا بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ اندر سے اور یہ باہر بڑبڑاتے رہے۔

یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا بلکہ پورے چار مہینے سے یہی ہو رہا تھا۔ روز یہی جھگڑا اُٹھتا۔ روز یہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو پھر ایک ٹھنڈی سانس کیساتھ کلکتہ کی یاد آئی اور سوچنے لگا کہ شاید اب میں ہمیشہ کے لئے اس اجاڑ گاؤں میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بتانا ہے۔ کاش ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آجاتا جو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی آتما کو سکھ دے لیتا۔ چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو۔ دوارے بھینس بندھی ہو۔ کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھروالی ہو جو ساری کے پلّو سے تھالی صاف کرے اس میں دال بھات لا کر سامنے رکھ دے۔ اُس کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف جھکے ہوں جیسے شرمائی سالی کا سر۔ بس مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک الگ چھپر ہو۔ دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس۔ ارے ہاں اپنے پاس کچھ ہو۔ اب کہاں گھروالی کی خواہش اور کہاں بچوں کا ارمان! چالیس کا سن ہونے کو آیا . . . . .

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اٹھی کہ اب دو چار برس جوانی اور ہے پھر اندھیرا پاکھ۔ جانے کب موت آجائے . . . . .

ایک زبردست اُمنگ اُٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مار دو۔ تھوڑی

دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اُس نے فقیرا کو پکارا
"بھیّا فقیرا"۔
فقیرا پیار کی پکار سن کر فوراً پاس آگیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حقہ کا ایک دم لے چکا تو گھسیٹے بولا:۔
"میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیا تم کہتے ہو کہ کلکتہ میں میں نے پچیس برس بھاڑ جھونکا، مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنا تو سیکھ ہی گیا ہوں کہ کون چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگائیں۔ یہ کریں وہ کریں۔ سچ کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے؟
گھسیٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے ابھی بات پوری نہیں ہوئی پھر فقیرا کی طرف دیکھ کر بولا۔
"اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں۔ . . . وہ تو تم مانتے ہی نہیں ——— اس میں تمہارا بھی بھلا۔ ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہوں گے تو سب ہماری برائی کو بھی اچھائی کہیں گے۔ جوگیوں کو دیکھو۔ اُن کے گھر ہُن برس رہا ہے ہُن۔ کہنے کو ہم شریف اور رذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آئے دن دوڑے جاتے ہیں کہ اچھے منگلو سیر بھر آٹا ادھار دیدو۔ دو کنکڑیاں نمک دیدو۔ ذرا سی تمباکو دیدو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں۔ دھتکار بھی دیتے ہیں۔ مگر ہم پھر جاتے ہیں۔ نہ جائیں تو کریں کیا؟"
فقیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا۔ گھسیٹے دم لے کر پھر کہنے لگا:۔

"اور ہم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا؟ کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں چین سے الگ ہی رہ لیں گے۔"

گھسیٹے نے ایک دم سے کچھ یاد کر کے فقیرا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا:۔

"ہاں تمہارا شادی بیاہ کرنا ہے۔ روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سہی کسی اور میں سہی۔ ارے ہاں۔ اس طرح تو کہیں بھی نہیں کر سکتے اور پھر یہ اماں کے لئے بھی اچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا۔

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا۔ مگر تب انہیں سُن کر فقیرا کو غصہ آگیا تھا۔ روپیہ کے لئے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا کل گیا اور شرافت وُہ دھن ہے جو پیڑھیوں چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی کیچڑ میں سوند جائے جب بھی مانجو چم چم کرنے لگتا ہے اور یہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے مٹی۔ مانا جوگیوں کے پاس روپیہ ہے پیسہ ہے۔ گھر گرستی ہے۔ ہم ہی ان کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے ہم ہی اُن سے روٹی ادھار مانگتے ہیں وُہ نہیں مگر اس سے کیا؟ ہاتھی لاکھ لٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ابھی ہم اور وہ مکھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چبوترے پر بیٹھیں گے اور وُہ دور زمین پر۔

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا۔ تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور

گھسیٹے روپیہ کا گھڑے کہ نہیں لوٹا، اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو کہاں پیسہ ملتا ہے پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس یہی ہے کہ اپنا دوزخ پاٹ لو اور موقع ملے تو کسی سے ہنسی دل لگی کر لو اور کیا دھرا ہے؟ بھورے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سو گئی۔ لیکن اب جو گھسیٹے، روزانہ شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھتے، آس جگانے کا یہ منتر اسی موہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس چونکی، انگڑائی لیکر اٹھی اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی فقیرا جسے کل تک کل کی کوئی فکر نہ تھی۔ آج جو مایا کے مندر کی راہ سوجھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے۔ ذرا یہ پھیر بدل جاتا۔ تھوڑی سی بکریاں اور ہو جاتیں اور ذرا چار پانچ روپے اکٹھے ہو جاتے۔ پھر ہمارا گھر بس جاتا۔ ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا؟ وہ رمضانی کی بیوہ، آنکھ ملاؤ تو کیسا ہنستی ہے۔ اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے۔ کیسا گدرایا گدرایا بدن ہے! جیسے پکا آم۔ کیسا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے وہ۔ دودھ وہ دوہے اُوپلے وہ پاتھے۔ وہی وہ متھے۔ اکیلی جھووں بانس اُٹھا اُٹھا کھیتوں میں ڈالے۔ کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھا لے گا اور پھر میں منہ تکتا رہ جاؤں گا

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیالات گونجنے لگے۔ وہ رمضان کی بیوہ سے کنی کاٹنے لگا۔ ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کے نکل جاتا۔ پندرہ بیس روز یوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ اکبارگی پیچھے سے آ گئی۔ اسے بھاگتے نہ بنی۔ کچھ باتیں ہوئیں، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی۔ پھر وہی ہوا جس کا فقیرا کو دھڑکا تھا یعنی اسی دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

(۴)

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی مدہم روشنی میں اُٹھے اور ایک ٹوکرے کو بانس سے لٹکا کر .... ایک ڈولی سی بنالی اور اس میں خوب سا پیال بھر دیا اور پھر بڑھیا کے پاس گئے۔ گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھپکلی کی طرح اٹھا لیا۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ وہ لگی باب، باب، باب کرکے اشارے سے کھانا مانگنے۔ گھسیٹے نے پہلی بار اُسے چھوا تھا۔ اُسے ایک عجیب اذیت ہوئی۔ جس سے اُس کا چہرہ عجب ہونق ہو گیا۔ ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے اور دوسری طرف بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے تھے۔ گھسیٹے نے اُسے بے جا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشہ کا برتن ہو ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اسے چیتھڑوں سے چھپا دیا۔

ایک طرف کا بانس فقیرا نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔ بکریاں ان لوگوں کو اس طرح جاتے دیکھ کر بے کسی سے میں میں کرنے لگیں جیسے یہ لوگ ان کو ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے پردوں کی اوٹ میں مُنہ چھپائے ہوئے گاؤں کی نکڑ پر آ گئے تو پو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کے چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا:

"کہاں چلے فقیرا؟"

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو برماتا نکل گیا۔ اس کے کندھے کا بانس کانپا۔

کسی وجہ سے گھسیٹے گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اُٹھا۔

"شبراتن کا حال خراب ہے۔ اماں کو لئے وہاں جا رہے ہیں۔"

"اماں کو لئے!" کسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اُٹھا

"شاباش تم لوگوں کو —— اپنی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!"

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا، اس وقت فقیرا اور گھسیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر، ایک گلی میں آ کر ڈولی رکھی —— گھسیٹے نے بڑھیا کو جو گنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں دو چیتھڑے سے باندھ کر اُس پر رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باب باب کرتے وقت ہاتھ بجائے منہ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔ مگر یہ احتیاط فضول تھی۔ کیونکہ دس برسوں سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منہ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے۔ اب سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہ تھی۔

بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہچکولے کھاتے کھاتے اور رات رہے سے اس وقت تک باب باب کرتے کرتے اتنی تھک گئی تھی کہ بلا چلائے اور کھانا مانگے جیسے بٹھائی گئی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو بری رہی۔ ساری کی کرائی پر پانی پھرا جاتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ فوراً گھسیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دوکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرا مانگا۔ اُس نے تھال پر چمٹی ہوئی بھڑوں اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کو اڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا اور جتنا شیرا بہہ آیا اسے انگلی سے پونچھ پانچھ کر ایک پتہ پر

ٹہکا کر گھسیٹے کو تھما دیا۔ اُس نے لا کر تیسرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اس کا چٹانا تھا کہ وہ فوراً باب باب کر کے اور مانگنے لگی

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آگئی۔ گھسیٹے نے بچہ فقیرے کو پکڑا کر ہدایت کی کہ موقع پر بڑھیا کو ایک انگلی چٹا دینا۔ فقیرا زندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی، بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دوکانوں سے وہ بھوچکا ہو چکا تھا۔ عقل چندھیا گئی تھی۔ ایسے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آگئی تھی۔ گھسیٹے مشاق تیراک کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی چہلیں کرنے لگتا ہے اور فقیرا نوسکھئے کی طرح جو پانی دیکھ دیکھ سہما جاتا ہے۔ گھسیٹے فقیرا کو حکم دے رہا تھا اور وہ کل کی طرح اُس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کٹی انگلیاں اور بیٹھی ناک والے کوڑھی منمنا کر ڈراؤنی آواز میں بولنے والی آتشکی بڑھیاں، چندھے چیتڑے بچے، جن کے ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے جو نجانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے، پھیکے، بے حیا، ویدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوؤں کا جنگل اور بدن پر میل کی کسہگل، چیتھڑے ٹھیکرے، میل، آنخور، بلغم، ناک، پیپ، مکھیاں، جراثیم، فریب، جھوٹ اور ان سب کو ڈھانک دینے والی، لوریاں دے دیکر، تھپک تھپک کر، سلا دینے والی دہا یا پن بے حسی!

—— اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیرا نے بھی ماں کی ڈولی لے کر غوطہ مارا۔ میل کچیل ہو، چاہے ذلت ہو، حیوانیت ہو، چاہے انسانیت ہو۔ مایا کے مندر کو یہی راستہ

جاتا ہے۔ اس وقت جبکہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اکیلا یہ کھلا ہوا ہے۔ صاف اور سیدھا راستہ، تنہا راستہ —— چھوٹی آنکھ کا دیدہ۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دیکر کہا۔

"سالے ادھر کہاں آیا ؟ بھاگ یہاں سے۔"

پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیونکہ ان کی ڈولی دیکھ کر ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی۔ فقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ کر وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اُس نے دو چار ماں بہن کی سنا کر کہا:

"تمہارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔"

ڈانٹ سنتے ہی فقیر تو فوراً بڑبڑا کر چپ ہو گئے مگر بڑھیائیں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کے لالچ میں دوڑا جا رہا تھا ان کو ڈانٹا۔

"چپ رہو بدنصیبو نماز ہو رہی ہے۔"

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے، کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا بوتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے لیکن وہاں کی فضا سے فقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اُس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی شیرا چٹا دیا۔ شیرا لگتے ہی گراموفون

کے ریکارڈ کی طرح وہ بجنے لگی اور مشین کی طرح اُس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اُسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچے نے جسے ایک شخص بھونک ڈلوانے کو لایا تھا گودی میں ہمک کر زور سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جوان اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بٹوا لئے اُدھر سے گزر رہی تھی اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اُس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیے بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتے کے سامنے تر نوالہ پھینک دیتا ہے کہ وہ ہمیں بھول کر اس میں جٹ جائے پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اُس کے ہاتھ میں تھوڑے دیگا۔ دے گا بڑھیا کو۔ اس کے سامنے کوئی چادر ہونا چاہیئے۔ جس پر آکر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا پھٹا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھوکا ہوں بابا، بھوکا ہوں بابا، ایک فقیرن گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک تگڑا فقیر حلق پھاڑ پھاڑ آوازیں لگانے لگا "سب دے گا اللہ ہی دے گا" فقیر بھیڑ بھاڑ، دھکم دھکا اور شور ہنگامے سے ایسا بھونچکا ہوا کہ منہ پھیلا کر ایک طرف تکنے لگا اور شیرا چٹانا بھول گیا۔ گھسیٹے نے چلا چلا کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا کہ اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے پتہ چھین کر خود ہی چٹا دیا۔ شیرے کا لگنا تھا کہ مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے پہلے سے اُس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی۔ جلدی میں اس کے منہ سے نکلا "اللہ ہر آفت سے بچائے"۔ اس صدا کو اس طرح دینے لگا

جیسے کوئی والنٹیئر انقلاب زندہ باد کہے کیونکہ دوسری لے اُسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ اُدھر دیکھ لیتے تھے۔ دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی یہ درد انگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ آس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ، یا ایک ایک، دو دو پیسے لئے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا چیز کیوں نہیں ہے۔ گھیسٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہو گیا اور خوب کڑک کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھسا تھا اس میں جوتی پیر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان ہو۔ اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر آج دونوں نعمتیں میسر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامان ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو پیسے کیسے برس رہے ہیں! توہی داتا ہے اور توہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک! اماں زندگی بھر کوشش کر مریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر گھر کی حالت سدھاریں۔ ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں۔ مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ حیلے روزی بہانے موت۔

(۶)

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور فقیر اڈولی لئے شہر کے باہر ایک شاہی گنبد کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے پھیری لگاتے رہے تھے

تکان سے چور چور تھے مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے گا رہے تھے اور زور زور سے ہنس ہنس باتیں کر رہے تھے

ایک کھنڈر کے سایہ میں ڈولی اتاری گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اسمیں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے۔ دال بھات اور ترکاریاں ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر ماں کی گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں تھیں بہت سی تیل کی پوریاں کئی قسم کی ترکاریاں۔ سیر بھر پنچ میل مٹھائی۔ چٹ پٹے کواب، مولیاں اور بڑی کا بنڈل آج کے پھیرے میں پونے دو روپیہ ملے تھے۔ جس میں سے ڈیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھسیٹے کی جیب میں اچک رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں تک چن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا اتنا ڈھیر تھا جو تھا اپنا تھا۔ جس طرح چاہے کھائیں اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈلی منہ میں ڈالی اور بدا جو ہی سے ان کو نگل گئے پھر بھکوں کی طرح مٹھائی پہ ٹوٹ پڑے گویا زندگی بھر کی بھوک اسی ایک آن میں بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی۔ ایک ایک پوری کا ایک ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دوزخ میں اتار لیتے۔ اس شور سے بڑھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

"لو آج تم بھی مزیدار چیزیں کھا لو کبھی کاہے کو کھائی ہوں گی۔"

گھسیٹے نے کچھ ٹکیاں اس کے منہ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بدحواسی سے باب باب کرنے لگی جیسے کی بات یہ کہ وہ کبھی نہ کسی طرح ہاتھوں پیروں کو ہلا ڈلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی کہ ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منہ میں بھر لے۔ فقیر اور گھسیٹے کے لئے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ ادھر اس کے منہ میں کچھ دیتے اور ادھر وہ نگل کر اور مانگنے لگتی۔ گھسیٹے جھلا کر بولا:

"لو تم بھی کیا یاد کرو گی"!

دانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے منہ میں دے دیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش سے چبانے لگی۔ مگر چبنا کیا وہ بار بار منہ سے نکل نکل آتا اور یہ پھر کسی نہ کسی طرح کپکپاتے ہاتھوں سے اسے اندر ٹھیل دیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پاٹنے میں جُٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور آگے پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ اسے پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلا پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی مٹھی میں زور سے دبا لیا اور منہ کی طرف لے چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلے کی پکڑ بے تکی تھی۔ وہ کسی طرح منہ کے اندر نہ جا سکا۔ رس گلا دب رہا تھا۔ اس کا شیرا ٹھڈی باچھوں سے ہوتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں پر بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہو گئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سست ہوتا گیا مگر ماں کا باب باب تیز ہی ہوتا گیا۔ آخر جب گھسیٹے اور فقیرا میں نگلنے کی بالکل سکت نہیں رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سرکا دیا اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاتی رہی۔ چلاتی رہی۔ آخر چلاتے چلاتے تھک کر وہ بھی ٹوکرے میں گر پڑی۔

فقیرا بہت خوش تھا۔ اُس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں چھپر نیا ہو گیا تھا۔ اس میں ایک طرف لپا تپا چولھا تھا جسے رمضانی کی بیوہ جھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلہ لئے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوی جلدی جلدی گرما گرم سُرخ سُرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں (گھر میں ایک پھول کی تھالی بھی آگئی ہے) ایک طرف بکری کا مسکا بھی ہے ..... فقیرا خوش تھا۔ بہت خوش۔

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی سی کامیابی! پونے دو روپیہ!! اور صرف ایک دن میں!! پچاس روپیہ مہینہ!! اُفوہ! اگر کہیں ہم کلکتہ میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی! اسنگل چاء بیڑیاں، تاڑی خانہ۔ بھنا گوشت، وُہ سالی نخریلی رنڈیاں۔ وُہ اُن کا مٹک مٹک چلنا۔ گود میں بل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر تک انہیں خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ سب بکریاں اپنی کر لی ہیں۔ حصّہ مانگا تو سر اکڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب ماں بھی حصہ بٹائے گی.. نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں گھر دے دوں گا۔ بکریاں نہ دونگا

مگر اماں کو نہیں دے سکتا آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب فقیرا کا خو ہی کیا ہے ؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی۔ آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ اماں کو میں نہیں دے سکتا۔ اگر وہ تکرار کریگا تو ماروں گا، سر پھوڑ دوں گا۔ حرامی سالا فقیرا!

گھسیٹے سوچ سوچ کر کڑھنے لگا۔ فقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اس کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا۔

"فقیرا سونا بعد کو پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چک جانا چاہئے"۔

"کاہے کا حصہ بانٹ ؟"

"ہاں اب تو کہو گے کاہے کا حصہ بانٹ۔ ارے گھر کا۔ بکریوں کا اور جو کمایا ہے اُس کا"

فقیرا تلملا کر اُٹھ بیٹھا۔

"پھر وہی گھر، پھر وہی بکریاں۔ ہزار بار کہہ دیا کہ ابا کا بنایا چھپر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ میں نے بنوایا ہے اور وہ بکریاں بھی مرکھپ گئیں۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں۔ چلا ہے حصہ بانٹ کرنے اور اتنے دن تو جو ہماری روٹی توڑتا رہا ہے"

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصہ میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا :۔

"اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لے جاؤ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دیدو اتنے دنوں ان کو اگر تم نے کھلایا ہے تو اب ہم کھلائیں گے"۔

"ہاں اب تو تو کھلائے ہی گا ؟ پندرہ برس میں پالتا رہا۔ گو موت کرتا رہا۔ تب اماں کی یاد نہ آئی۔ اب جو کمائی کے قابل ہو گئی تو اماں تیری ہے، تجھے دیدوں ؟ مجال ہے

تیری کہ تو لے جائے۔"

گھسیٹے پر بھوت سوار ہو گیا اور وہ غصہ میں ماں کی طرف لپکا جیسے اُس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا مگر فقیرا فوراً کود کر سامنے آگیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارا حد سے اونچا ہو گیا اُس نے بڑھکر فقیرا کو زور سے دھکا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ گویا وہ کوئی گٹھڑی ہے۔ جس طرح بلّی چوہے پر جھپٹتی ہے فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اُس کے سر اور کمر میں ہاتھ دیکر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلّی کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو عو عو کر کے حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوتی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ بجائے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھیا کے مر جانے کے ڈر سے اُسے خود ہی چھوڑ دیا۔ مگر فقیرا جیسے ہی اس کو لیکر گالیاں دیتا پیچھے ہٹا ہے۔ گھسیٹے بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر پھاند پڑا۔ وہ تڑ سے کھڑے قد نیچے گر پڑا اور بڑھیا چیختی قلا بازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اُس کے سینے اور منہ پر گھونسے جمانے لگا جیسے جیسے گھونسے کھاتا ویسے ہی ویسے زور سے گلا دباتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دیئے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈھیلے غلوں کی طرح باہر نکل آئے۔ منہ بھیانک ہو گیا اور ہاتھ پاؤں برد گئے۔ اب گھسیٹے کا غصہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہو گیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ رام لیلا کے بیجا کی طرح موذی ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لئے۔ کلکتہ میں ایسے ایسے کئی

تھے یہ دیکھ چکا تھا۔کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کس کو پروا ہوتی ہے؟ مرگیا۔ مرگیا۔ ہاں۔۔۔۔ فقیرا۔۔۔۔ ناحق مرا۔۔۔۔ مان لیتا میری بات۔ میں نے کیا بُرا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی اب مجھے دیدو۔ ارے ہاں میں بھی تو کچھ دنوں زندگی کی بہار دیکھ لوں۔ میرے بھی تو جان ہے۔ بجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا۔ جیسا کیا ویسا بھگتا۔

ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو۔۔۔۔ پیاری اماں۔ کلکتہ، وہاں کی بھیک کا کیا کہنا! اب مزا ملے گا کلکتہ کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مڑا، دیکھا تو وہ آدھی چیت آدھی پٹ مٹی کے چھوت کی طرح ڈھیر ہے۔ آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔ مُنہ کلھیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک میں لتھڑی آدھی چبی آدھی پوری غذا نکل رہی ہے۔ نکتیاں۔ گلاب جامن پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے۔۔۔۔ لونڈے کے لونڈے۔ زرد زرد چھیچھڑے۔

گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا۔۔۔۔ بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونہ کالی بلاؤں کا بھٹ معلوم ہوتا تھا۔ پت جھاڑ ہوا کے جھکڑ سیکڑوں میل سے کروڑوں درختوں کو تاراج کرتے، مردہ پتوں کو اٹھا اٹھا کر پٹکتے، ہولناک سُروں میں سائیں سائیں کرتے ایک طرف سے آرہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اڑا لے جائیں گے۔ گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی، دونوں کے پہلو میں اُس کی آخری کوشش کی بھی

لاش تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مر کر وہ اُس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔ اُس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی۔ فقیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اس کی یاد کلکتہ کی بیکسی میں بھٹکے مسافر کا دیا تھی۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا سے رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب تو کشتی کنارے لگ چلی ہے۔ پیشہ مل گیا ہے اور اس کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آ گیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا مگر ابھی خود اس کے قابل نہیں بنا تھا —— امید کی آخری کرن ڈوب گئی۔ اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں، طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف تھیں۔ اس کے بھیانک بھنور منہ پھاڑے بڑھ رہے تھے اور پاس تنکے تک کا سہارا نہ تھا۔

گھسیٹے سر جھکائے افق کی طرف چل کھڑا ہوا ✣

سفرنامہ

قدرت کی بانہوں میں

قدرت کی بانہوں میں

مجھے پہاڑوں میں عجب دلکشی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا دیکھنا، ان پر چڑھنا اترنا، وہاں کی صبح و شام، وہاں کا طوفان و سکون، ان باتوں میں مجھے کچھ وہی رومان محسوس ہوتا ہے جو کہانیوں کی دنیا میں جہاں تخیل کو پرواز کے لئے کہکشاں کے ایسے راستے ملتے ہیں جو نگاہوں سے اوجھل کسی دور انجان منزل کو نکل جاتے ہیں۔ ادھر پہاڑ میری نگاہوں کے سامنے آیا اور ادھر میں کھو گیا، وہاں کیا کیا ہوگا؟ وہاں کے درخت اور پھل پھول، چڑیاں اور درندے کیسے ہوں گے! ان سب سے نرالے ہوں گے وہاں کے بسنے والے انسان، بھلا ان کی زندگی کیسے گذرتی ہوگی؟ ان کے روزانہ کے دھندے، زندگی کے چھوٹے موٹے دکھ سکھ، عشق اور مامتا؟ ان انسانی جذبات کے رنگ و روپ اس سرزمین پر کیا ہوں گے۔ پہاڑ کے ان حصوں کے اوپر اور اس سے بھی اوپر کیا کیا ہوگا؟ کیسے کیسے گھنے جنگل! کیسے کیسے پرشور آبشار! ڈراؤنے کھڈ! سر بفلک برفیلی چوٹیاں! ہر موڑ پر

ایک ہیبت ناک حسن یا رومان بھری عظمت!

جب تک میں پہاڑ پر رہتا ہوں میری آنکھیں آنکھوں سے اوجھل وادیوں اور چوٹیوں پر آوارہ گھومتی رہتی ہیں۔ جب بڑے بڑے پہاڑوں کے گورے گورے چہرے بادلوں کی اوٹ سے تاک جھانک کرتے ہوتے ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ میں قدرت کے حرمِ خاص میں، جہاں جاتے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ دوانہ گھسا چلا جا رہا ہوں۔ جب اودی گھٹائیں پہاڑوں کی گود میں مچل مچل کر دھاڑتی ہیں۔ کڑاک اور گرج چٹانوں سے ٹکراتی ہیں تو مجھے اس طوفانی شور میں خون میں گرما دینے والا ایک راگ سنائی دیتا ہے جو بڑی سے بڑی مردانہ مہموں کا راستہ سُجھا دیتا ہے۔ جب مَیں کسی پہاڑ کی چوٹی سے سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا منظر دیکھتا ہوں اور میری نگاہوں کے سامنے زمین کی تہیں کی تہیں کھُلی پڑی ہوتی ہیں —— ہزاروں گاؤں جنگل کے پتوں کی طرح بکھرے ہوئے، وادیاں جن میں شہر کے شہر سما جائیں اور پتہ نہ چلے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح نظر کے سامنے، لق و دق میدان، گھنے جنگل اور سیکڑوں پہاڑیاں بے حقیقت سی پڑی ہوئیں —— اس وقت میں دیوتا ہوتا ہوں اپنی حدِ نظر کا۔

پہاڑوں کی تاروں بھری رات! وُہ حسن و عظمت! اونچے پہاڑ وقار و سنجیدگی سے خاموش کھڑے ہوئے ان کے قدموں پر وادیاں اپنے سینوں میں انجان تاریکیاں لئے بے خبر سوتی ہوئیں۔ اور اوپر آسمان، یعنی ململ کا وہ کامدانی دوپٹہ، وُہ تو عظمت کے ان سنگین مجسموں کے شانوں پر بکھرنے کے لئے بے قرار ہوتا ہے۔ ایسے میں کائنات ایک ماوی عبادت خانہ بن جاتا ہے اور میری روح مجھے چھوڑ کر ان ٹھوس حقیقتوں میں سرایت کر جاتی ہے۔

ایک بار خوش نصیبی نے مجھے رانچی پہنچا دیا۔ ہوٹل کے جس کمرے میں مجھے جگہ ملی۔ اس کے برابر کے کمروں میں کوئی بہاری راجہ صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ بڑا لاؤ لشکر ساتھ تھا۔ دو چمکیلی بھڑکیلی نخریلی رنڈیاں، ایک حقہ بھرنے والا خوبصورت سا لڑکا۔ درجن بھر ملازم جو ضرورت پر مصاحبی کا کام بھی کر دیتے تین بڑے بڑے کتے راجہ صاحب کے کمروں میں ہر وقت شور رہتا تھا۔ رنڈیاں گاتی تھیں۔ لونڈا قہقہے لگاتا تھا ملازم "جی حضور" "بجا ہے حضور" کا ہنگامہ اٹھاتے تھے۔ راجہ صاحب پیٹ پر ہاتھ پھیر پھیر کر ڈکارتے تھے اور کتے غراتے تھے۔

میرا کمرہ کمروں کی دو قطاروں کے جو زاویہ قائمہ پر ملتی تھیں سنگم پر تھا۔ ایک قطار چھ کمروں کی تھی جو پوری راجہ صاحب کے قبضے میں تھی اور دوسری بہت لمبی۔ اس لئے میرا راستہ دونوں قطاروں کے سامنے ہو کر جاتا تھا چاہے ادھر سے جاؤں چاہے ادھر سے جیسا کہ چاہئے تھا نزدیک والا راستہ، یعنی جو راجہ صاحب کے کمروں کے سامنے ہو کر جاتا تھا۔ اختیار کیا

ایک دن میں باہر سے آ رہا تھا کہ راجہ صاحب کے ملازم نے "اجی سنئے گا ذرا" کہکر مجھے روکا اور پھر بڑی بدتمیزی سے یہ گزارش کی کہ میں ادھر سے نہ جایا کروں۔ کیونکہ اس سے راجہ صاحب کے تخلیے میں خلل پڑتا ہے۔ میں نے اس گذارش کی تعمیل سے انکار کر دیا اور ہوٹل کے منیجر سے شکایت کر دی۔ منیجر عجیب کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ میری سنے یا نواب صاحب کی۔ بات میری معقول تھی مگر نواب صاحب ہوٹل کے پرانے ٹھہرنے والے تھے۔ آمدنی خوب ہوتی تھی بھلا ان سے کیسے بگاڑ کیا جا سکتا تھا۔ آخر منیجر نے مجھ سے خوشامد سے کہا کہ آپ دوسری قطار کے ایک عمدہ کمرے میں اتنے ہی کرایہ پر اٹھ جائیے۔ مگر میں نے کہا نہیں رہوں گا تو اسی کمرے میں رہوں گا اور اسی راستے سے آیا جایا کروں گا۔ ورنہ پھر ہوٹل چھوڑ دونگا

کہنے کو تو میں نے ہوٹل چھوڑنے کو کہہ دیا تھا مگر پریشان تھا کہ جاؤں گا کہاں۔ ان دنوں رانچی میں جگہ کا ملنا آسان نہ تھا۔ رات بھر اسی پریشانی میں نیند نہ آئی۔ لیکن صبح کو اتفاق سے ایک ایسی بات ہو گئی جس سے راجہ صاحب کو معلوم ہو گیا کہ میری پہنچ کانگرسی وزیروں تک ہے پھر تو دوسرے ہی دن صبح کو وہی ملازم آیا اور تمیز سے گذارش کی کہ چلئے آپ کو راجہ صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ میں نے جانے سے انکار کر دیا

شام کو میں باہر جا رہا تھا جیسے ہی راجہ صاحب کے کمرے سے گذرا، وہ ننگے پاؤں بھد بھد کرتے نکل آئے اور آواز دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اُنہوں نے پہلے تو میرا راستہ کھوٹا کرنے کی معافی مانگی اور پھر اپنے گستاخ ملازم کی بدتمیزی کی۔ کہنے لگے "اس نے آپ کو پہچانا نہ تھا"

بات معقول تھی جو شخص پہچانا نہ جائے یا جس میں پہچان کی کوئی بات نہ ہو۔ اس کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آنے کا لوگوں کو حق ہوتا ہی ہے اور کسی کو ہو نہ ہو راجہ صاحبان کے ملازموں کو تو ضرور ہی ہوتا ہے۔

اس معقول عذر پر میں مسکرا دیا۔ وہ سمجھے میل ہو گیا۔ میں نے بھی کہا چلو ٹھیک ہے

راجہ صاحب ایک آرام کرسی پر پیٹ کھولے لیٹے رہتے تھے۔ چپڑ چپڑ پان چباتے تھے، حقہ پیتے تھے یا پھر بے بات کی بات پر ہنستے تھے۔ ہنسی کی سیکڑوں باتیں آئیں اور نکل جائیں۔ انہیں خبر بھی نہ ہوتی تھی مگر پھر بیٹھے بٹھائے کسی چھوٹی موٹی بات پر ٹھٹھا مار دیتے اور پھر جو ہنسنا شروع کرتے تو توند دھونکنی بن جاتی، آنکھوں میں آنسو آ جاتے مگر ہنسی بند نہ ہوتی

راجہ صاحب کی ہنسی کا سرگم مقرر تھا۔ پہلے تو وہ ہوائی کی طرح سن سے آسمان پر چڑھ جاتی پھر پن ڈبی کی طرح ایک غوطہ مار کر فوراً اُبھر آتی۔ اس کے بعد پھر کٹے کنکوے کی طرح اُٹھتی گرتی

جھکولے کھاتی ہوئی کسی طرف کو چلی جاتی۔ جب ان کا ٹھٹھا دفعتہً اٹھتا تو رنڈیاں اور ملازم فوراً چوکنا ہو جاتے اور جس سے جہاں سے بن پڑتا وہیں سے سنگت شروع کر دیتا اور جب تک راجہ صاحب تھک نہ جاتے یہ قوالی چلتی رہتی

ایک بار راجہ صاحب کو ٹیکسیوں کی ضرورت ہوئی۔ انہوں نے مینجر کو بلا کر پوچھا کہ "پانچ ٹیکسیاں مل سکتی ہیں؟ مینجر نے جواب دیا "ملنی چاہیئے"۔ مینجر کا یہ کہنا تھا کہ چھوٹی راجہ صاحب کی ہنسی۔ ہنسی کا اٹھنا تھا کہ ملازموں اور رنڈیوں سے جو جہاں اور جس حال میں تھا۔ اس نے فوراً سنگت کی۔ ہنسی کی ضربیں بند کرنے کے بعد راجہ صاحب اتنا تھک گئے کہ دیر تک خاموش پڑے رہے

اسی طرح ایک بار ہوٹل کی کھڑکیوں سے سڑک پر ایک فقیرن دکھائی دی جو چت پڑی تھی اور ایک ڈیڑھ سال کا بچہ اوپر چڑھا دودھ پی رہا تھا۔ کوئی شخص بچے پر ترس کھا کر کہنے لگا کہ اس کی ماں سرشار پاگل ہے۔ اس کو کچھ ہوش نہیں رہتا۔ بچہ خود ہی جب موقعہ ملتا ہے بچارا دودھ پی لیتا ہے جو جو اس وقت موجود تھا، بچے اور اس کی ماں پر ترس کھانے لگا مگر راجہ کا تو اُٹھا قہقہہ۔ اور حسب دستور بلا کسی الٹی میٹم کے۔ یہ حادثہ کچھ ایسا اچانک تھا کہ تجربہ کار ملازمین تک سٹ پٹا گئے۔ مگر پھر کسی نہ کسی طرح اپنے اپنے جذباتی ٹھاٹھ درست کر کے سُر میں سُر ملانے لگے۔ ان کے بعد رنڈیاں بھی کسی نہ کسی طرح اس میں شریک ہو گئیں۔

جیسی نواب صاحب کی ہنسی تھی۔ ویسی ہی ان کی سنجیدگی بھی۔ ایک مرتبہ ان کا حقہ بھرنے والا منہ چڑھا لڑکا بڑی رعونت سے ایک ملازم کو مارنے بڑھا مگر راہ میں ٹھوکر کھا کر جو گرا ہے تو ساری آن بان خاک میں مل گئی۔ اس پر ملازم اور رنڈیاں سب بے اختیار

کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ مگر راجہ صاحب ویسے ہی کے ویسے دیکھتے رہے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ مجبوراً ساتھ والوں کو بھی اپنی ہنسی کو گلا گھونٹ کر زندہ دفن کرنا پڑا۔

راجہ صاحب کی ہر بات مزے کی تھی۔ ایک بار اُن کا ملازم تار کا ایک لفافہ لایا راجہ صاحب نے اس کو دیکھتے ہی پوچھا۔

"ابے یہ کیا ہے؟"

"حضور تار"

"تار کا بچہ۔ یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں —— کون لایا ہے؟"

"حضور ڈاکیہ"

"ابے ڈاکیے کے بچے، ڈاکیہ نہ لاتا تو آتا کیسے؟ کب آیا؟"

"حضور ابھی ابھی"

"ابے ابھی کے بچے، یہ کون نہیں جانتا۔ لا اِدھر لا۔"

اگر راجہ صاحب کی ایک خصوصیت اور نہ بیان کر دی جائے تو ان کی تعریف مکمل نہیں ہو گی اور وہ یہ کہ وہ اپنی رعایا کا (جو کسان سبھا میں شریک تھی) تذکرہ بلا گالی کے نہیں کرتے تھے

اس کے بعد اتنا اور سُن لیجیے کہ راجہ صاحب زمیندار کانفرنس میں بہت اچھی پوزیشن رکھتے تھے اور حکومت برطانیہ کی نگاہوں میں قوم پرست تعلیم یافتہ نوجوان رئیس تھے۔ ان کی خوبیوں کا اعتراف اس نے "خان" اور "بہادر" سے کیا تھا۔

(۲)

رانچی کو ایک پلیٹو کہنا چاہیے، ایک ناہموار سا میدان جس میں کہیں کہیں نیچی نیچی پہاڑیاں نظر آجاتی ہیں۔ اسے دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ وہاں میرے پہاڑ والے تخیل کے لئے کوئی غذا نہ تھی۔ پھر سننے میں آیا تھا کہ اطراف میں کئی آبشار ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ جیسا یہ پہاڑ ہے ویسے ہی آبشار بھی ہوں گے یعنی معمولی سے چھوٹے موٹے جھرنے۔

ایک دن صبح آٹھ بجے راجہ صاحب نے کہلوایا کہ چلئے آبشار دیکھ آئیں ٹیکسیوں کا انتظام ہو گیا ہے۔ میں پہاڑوں میں گھومنے کا شوقین ضرور ہوں، مگر ایسا بھی نہیں کہ راجہ صاحب ایسے شخص کے ساتھ چلا جاتا۔ راجہ صاحب بارہ بجے تک واپس آ گئے۔ انہوں نے اپنے مصاحبوں اور زندگی کے سہارے سے لیکر گوتم آبشار (ہنڈرو فال) کا جو بیان دیا۔ اس سے مجھے صرف تین باتیں معلوم ہوئیں (۱) آبشار تک پہنچنے کے لئے بہت سی سیڑھیاں چڑھنا اترنا پڑتی ہیں (۲) پانی گرنے سے بہت شور ہوتا ہے (۳) پانی پینے میں بہت ٹھنڈا ہے۔

ایک دن صبح آٹھ بجے میں بائیسکل پر سوار گوتم آبشار کی طرف جا رہا تھا۔ وہ رانچی سے ۲۲ میل پر ہے یعنی ۴۴ میل کا آمد و رفت کا سفر! اور سفر بھی پہاڑی راستوں کا جہاں مسلسل اتار چڑھاؤ کا سامنا! مگر میں نے ایک بڑی بات کی ہمت کی تھی اور اس میں کامیابی حاصل کر کے خوش ہونا چاہتا تھا۔ آبشار تک ٹیکسیاں جاتی تھیں مگر ان کا کرایہ بہت تھا اور لاریوں کا وقت ناموزوں تھا

موسم خوشگوار تھا۔ نہ سردی، نہ گرمی۔ سفید سیمنٹ کی سڑک پر اونچے اونچے درختوں

کے لمبے سرمئی سائے بچھے ہوئے تھے۔ ہوا کے ملائم ملائم جھونکے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آجاتے اور بدن کو گدگداتے ہوئے، ٹہلتے نکل جاتے۔ راستہ معمولی چڑھائی اتار کے سوا، تقریباً ہموار تھا۔ دور بڑے پہاڑیوں کا ایک سلسلہ نظر آرہا تھا۔ ایک گھنٹہ چلنے کے بعد وہ قریب آنے لگا اور ذرا اونچا اور شاندار معلوم ہونے لگا

جب نگاہیں اس کی عادی ہو گئیں تو میدان پھر ہموار معلوم ہونے لگا۔ ڈھائی گھنٹے چلنے کے بعد ذرا منظر بدلا۔ اب اس میں کچھ سنجیدگی آگئی۔ اونچی چوٹیوں والے کھڑے پہاڑ ایک دوسرے پر لدے ہوئے چلے آتے تھے۔ بہت سے نالے بھی شور مچاتے، بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتے ہوئے راہ سے گزرتے تھے، کچھ دور اور آگے چل کر سڑک منڈلاتی ہوئی چلنے لگی اور ہر موڑ پر ایک نئی پہاڑی یا نیا کھڈ نظر آنے لگا

یہاں سبزے کی اتنی کثرت تھی کہ زمین نظر نہ آتی تھی۔ زمین پر گھاس، گھاس پر درخت درختوں کے تنوں کے گرد جھاڑیاں اور ان کی شاخوں پر بیلیں —— یہ تصویر صرف سبز رنگوں سے بنائی گئی تھی۔ شوخ سبز، ہلکا سبز، دھانی سبز، نیلاہٹ لئے ہوئے سبز۔ ہاں بیچ میں مانگ کی طرح دودھیا سفید سڑک تھی اور اوپر شوخ نیلا آسمان۔ چڑیوں کی چوں چوں، اور جھینگروں اور ٹڈیوں کی بھن بھن یہ ننھی ننھی آوازیں کروڑوں بلکہ اربوں کی تعداد میں عظیم الشان شور بن گئی تھیں جس سے پہاڑ اور جنگل گونج رہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ وہی شور مچا رہے ہیں۔ اس میں مجھے کچھ مردانہ راگ کا مزا ملنے لگا۔

اب میرے کوہستانی تخیل کو غذا ملنے لگی اور وہ تمام احساسات تازہ ہونے لگے جو پہاڑی منظر سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت میرے رومان پسند تخیل نے رابن سن کروسو سامنے لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ اونچے زبردست پہاڑ کی ایک کھوہ میں ایک آزاد انسان اپنے

بیوی بچوں سمیت رہتا ہے۔ نہ اسے عزت کا لالچ نہ ذلت کا خوف۔ سب سے بڑی نعمت یعنی فراغت اور سکون اسے میسر۔ اسے تندرستی اور تندرستی سے پیدا ہونے والی خوبصورتی کی نعمت حاصل ——— وہ نعمت جس پر متمدن شہروں کی ساری آبادی کو رشک آسکتا ہے ——— شیروں کا سامنا وہ کرتا ہے، ناگوں کا مقابلہ وہ کرتا ہے خطرناک جھاڑیوں اور انجان کھوہوں میں وہ گھستا ہے ——— وہ بہادر ہے اور نڈر۔

ایسی زندگی کی تصویر نے دھیان کو اتنا موہ لیا کہ مجھے محسوس بھی نہیں ہوا کہ میں کئی میل کی کھڑی چڑھائی طے کر رہا ہوں۔ اس کی خبر اس وقت ہوئی جب دیکھا کہ سڑک کے برابر کا پہاڑ جس کے گرد ناچتی ہوئی سڑک جا رہی تھی نیچا ہو گیا ہے اور میں اونچا ہو گیا ہوں۔ ابھی اس فتح کی پوری طرح لذت بھی نہیں لینے پایا تھا کہ ڈھال شروع ہو گئی۔ بائیسکل تیز ہوئی۔ اور تیز ہوئی ——— اور تیز ہوئی۔ اب مجھے پتہ چلا کہ یہ ڈھال کتنی میل لمبی ہے۔ دل پر پرخطر زندگی کی آرزو ایسی چھا چکی تھی کہ بریک لگانے پر طبیعت کسی طرح راضی نہ ہوتی۔ درخت بے تحاشہ پیچھے بھاگ رہے تھے۔ برابر کا پہاڑ جو میرے نیچے آگیا تھا اب پھر تیزی سے اُگ رہا تھا۔ سڑک پر ایک مینا بیٹھی تھی بائیسکل دیکھ کر اس نے پر تولے ہی تھے کہ بائیسکل نکل گئی۔ نجانے اُس کے برابر سے یا اوپر سے۔ اس وقت ہینڈل کا ذرا سا گھمانا بھی میرے بس سے باہر تھا۔ اگر راہ میں ذرا سا بھی ڈھیلا آجاتا تو بائیسکل کہیں ہوتی اور میں برابر کے کھڈ کی گہرائی ناپتا ہوتا ——— کچھ نہ ہو گی میری رفتار تو ساٹھ میل فی گھنٹہ ضرور ہو گی ——— بس بس دم سادھے آگے سو قدم تک دیکھ سکتا تھا۔ ایکا ایکی بائیسکل کی رفتار ہلکی ہونے لگی اور ہوتے ہوتے آپ ہی آپ معمولی ہو گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ جس سڑک پر میں اتر رہا تھا۔ وہ نیچے بڑی جھک رہی ہے۔ اب میں پھر اوپر جا رہا تھا بلکہ رفتار کے زور میں خاصا اونچا

چڑھ آیا تھا ـــــ وہ مارا!

ملائم ہوا کے جھونکے دل کو ٹھنڈ اور سکون بخش رہے تھے۔ چڑیوں اور جھینگروں کا شور ـــــ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آس پاس کے سر بفلک پہاڑ، گھنے جنگل اور تیز رو ندی نالے سب سکون اور اطمینان کا گیت الاپ رہے ہیں۔

آخر پکی سڑک سے رخصت ہو کر ایک طرف مڑنا پڑا۔ اب میں پہاڑوں کے جگر میں گھس رہا تھا۔ یہاں کی زمین پر ٹیلوں پر غاروں اور پہاڑوں پر سب پر جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ سبز رنگ کی تہہیں پر تہہیں چڑھی ہوتی تھیں۔ مگر اس نزاکت میں بھی عظمت اور شوکت تھی۔ یہ وہ پرستان تھا جہاں کی پری بھی قد و قامت میں دیونی تھی مگر اس کے جواب میں ہر دیونی بھی حسن میں پری تھی۔ ایک زبردست چٹان خوفی دیو کی طرح سینہ تانے کھڑی تھی مگر سر سے پاؤں تک کالے نازک مخمل کی چادر اوڑھے ایک طرف ایک تیس فٹ کا سوکھا تنا اژدہے کی طرح بل کھایا کھڑا ہے مگر پھولدار بیل کا جامے دار پہنے

زبردست اتار، پھر کھڑی چڑھائی، اس کے بعد ڈھلوان راستہ اور چکردار پگڈنڈی۔ انہیں برسالوں سے راستے کی بناوٹ تھی ـــــ تمدن سے ۲۵ میل دور، قدرت کی اس خالص تماشاگاہ میں بھی تمدن کی ایک لہر تھی، ایک طرف ایک بڑا سا مکان بنا تھا جس پر کسی زمیندار کا نام لکھا ہوا تھا۔ مکان بالکل خالی تھا۔ دروازے پر کنڈی لگی ہوئی تھی۔ دل نے کہا کاش یہاں رہنے کو مکان مل جاتا! ایک نہیں تمدن کی دو لہریں تھیں۔ ایک لہراتی منڈلاتی ہوئی ریل کی پٹڑی بھی تھی۔ جو کچھ تو چھوٹی لائن ہونے کی وجہ سے اور کچھ اونچے اور بھاری پہاڑوں میں گھری ہونے کی وجہ سے کھلونا سی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ آئی اور نکل گئی۔ اب سامنے ایک اونچا پہاڑ

تھا جس پر ہمارا راستہ بالکل کھڑا لیکن ناگن کی طرح بل کھاتا ہوا اوپر کی طرف جا رہا تھا یہاں قدرت کا فرمان تھا کہ پیدل چلو۔ گستاخ سے گستاخ اور باغی سے باغی بھی اس کی نافرمانی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سائیکل ہاتھ میں لی اور اوپر چڑھنے لگا۔

اکتیس میل کا سفر طے ہو چکا تھا اور وہ بھی پہاڑ کے سخت اتار چڑھاؤ کا۔ مناظر کی رنگا رنگی اور اس کی نت نئی شکلوں نے ابھی تک تکان محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ اب جو ایسی سخت چڑھائی تھی تو چار ہی قدم چل کر معلوم ہو گیا کہ میرے جسم کی کیا حالت ہے۔ رواں رواں دکھ رہا تھا۔ ٹانگیں ہر قدم آگے جانے سے انکار کرتی تھیں۔ اس پر قیامت یہ کہ مجھے صرف اپنے ڈیڑھ من کے جسم ہی کو اوپر نہیں لے جانا تھا۔ ڈیڑھ من کا ایک بوجھ اور بھی گھسیٹ کر یا لاد کر اوپر پہنچانا تھا۔ بائیسکل نے یہاں تک تو ساتھ دیا تھا۔ لیکن اب وہ نہایت تیزی سے مجھے پیچھے گھسیٹ رہی تھی۔ بعض وقت تو ایسا جھٹکا دیتی کہ کنکریلی پگڈنڈی پر پاؤں جمانا مشکل ہو جاتا۔ آخر اسکی ہٹ دھرمی سے مجبور ہو کر اس کو لادنا ہی پڑا کندھے پر۔

اس ایک فرلانگ کی چڑھائی نے مجھے بالکل ہی بیدم کر دیا۔ لیکن جب تھکا ہارا پسینے میں تر اوپر، ہانپتا کانپتا اوپر پہنچا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں ——— آبشار نہیں۔ آبشار کی اتنی خوبصورت تو نہیں مگر اس سے زیادہ ضروری چیز ——— ایک چاء کی دکان، جنگل میں منگل! اس نعمت کو تو میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا ——— اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ریگستان میں لُو سے جھلستے، تپتی ریگ کے ذرے پھانکتے، پیاس سے بدحواس کارواں کو نخلستان دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہو گی ——— فوراً بنچ پر آرام سے بیٹھ گیا اور جیب سے اُبلے ہوئے انڈے نکالے، چاء منگوائی اور خوب دادِ عیش دی۔

آگے بڑھے تو نئے حالات سے سابقہ پڑا۔ سیڑھیوں کا ایک سلسلہ نیچے جا رہا تھا جو کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتا تھا۔ سینکڑوں برس سے آنے جانے والوں کے قدموں اور بارش کے پانی سے سیڑھیاں اتنی گھس گئی تھیں کہ کہیں کہیں تو ان میں اور ایک ڈھلوان چٹان میں تھوڑا ہی سا فرق رہ گیا تھا۔ یہ سیڑھیاں درختوں کے اندر اندر چلی جا رہی تھیں۔ ارد گرد بدرنگ اور بے لطف تنے تھے، اوپر ویسے ہی بدرنگ اور بے لطف تنے تھے، اوپر ویسی ہی بدرنگ اور بے لطف شاخیں ——— کہیں کہیں بے رونق گھاس کے جھنڈ بھی نظر آجاتے تھے۔ گھٹی ہوئی ہوا تھی جس میں کھٹی کھٹی برساتی بُو ملی ہوتی تھی اور مچھروں کی کانٹے دار چادر تھی جو ہر طرف سے لپیٹے لیتی تھی اور ایک زبردست غراٹا تھا جو سارے پہاڑ اور جنگل کو سر پر اٹھائے ہوئے تھا۔ یہ تھی وہاں کی فضا۔ کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ ہم انہیں مناظر کے باطن میں چل رہے ہیں، جن کے ظاہر پر ابھی تک لوٹ پوٹ تھے۔

اترتے رہے، اترتے رہے اور ڈرتے رہے کہ واپسی میں یہی سیڑھیاں چڑھنا ہوں گی (ہاں یہ تو بتا دوں کہ بائیسکل اب میرے ساتھ نہیں تھی) کافی نیچے جانے پر اوپر کے درخت اور گھنے ہو گئے تھے۔ جس سے دھندلکا چھا گیا اور جی اوبھنے لگا۔ اتنے میں سامنے چاندی کی ایک بہت بڑی چادر نظر آئی ——— ایک ہی جھلک نے بھلا دیا کہ میں کہاں ہوں۔ گھٹا چھٹ گئی اور چاند نکل آیا۔

رفتہ رفتہ آبشار کا نظارا سامنے آتا گیا۔ ایک دریا تھا جو ۵۰ فٹ کی بلندی سے ایک پہاڑ پر گر رہا تھا۔ وہاں کی چٹانیں اس کو دو زبردست چادروں میں تقسیم کر کے تقریباً دو سو فٹ سے نیچے گرا رہی تھیں۔ یہ دونوں آبشار ذرا آگے پیچھے ہو کر میری داہنی طرف گر رہے تھے اور دریا بن کر تیزی سے بہہ رہے تھے۔ سامنے بہت دور سے ایک اور دریا

چٹانوں کو نانگھتا پھاندتا بھاگتا چلا آ رہا تھا اور پہلے والے دریا سے بہت جوش و خروش سے مل رہا تھا جیسے مدتوں کے بچھڑے ہوتے۔ جس جگہ آبشار گر رہے تھے اور دریا سے دریا مل رہے تھے وہاں سیکڑوں بڑی چھوٹی چٹانیں سر نکالے کھڑی تھیں۔ انہوں نے آبشار اور دریاؤں کی عجیب عجیب شکلیں بنا دی تھیں۔ ادھر سر سراتی ہوئی چادر، ادھر بھپر بھپر کرتا ہوا نیتہ۔ ادھر اُبلتا ہوا چشمہ، ادھر جھاگ چھوڑتے ہوئے نالے، ایک طرف زور و شور سے چکر مارتا ہوا بھنور، تو دوسری طرح چٹانوں میں گھرا ہوا ایک ساکن چشمہ۔ ایک طرف ایک بڑی چٹان سے ٹکرا کر پانی انار کی طرح چھوٹ رہا ہے تو دوسری طرف ایک نوکیلے پتھر سے پانی کی ایک دھار پھلجھڑی بن کر پھول گرا رہی ہے۔ ایک طرف پانی کی بڑی بڑی لہریں جل پریوں کا ناچ ناچ رہی ہیں تو پاس ہی ایک موٹی سی دھار سفید ناگ کی طرح بل کھاتی ہوئی غصہ میں پھنکاریں مار مار کر ایک چشمہ پر حملہ کر رہی ہے۔ ایک طرف ایک حوصلہ مند فوارہ ہے جو بہت اونچا اڑنے کی کوشش میں ہوا سے کشتی لڑ رہا ہے۔ کبھی ہوا اس کا زور توڑ دیتی ہے تو کبھی وہ ہوا کا۔

اس تمام شور و شغب کے بیچ میں بڑی بڑی چکنی چٹانیں سکون سے کھڑی آسمان کو تک رہی تھیں۔ آبشار کے دونوں طرف، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ چاروں طرف زبردست اونچے اونچے پہاڑ تھے جو دیو قامت درختوں کا جامہ پہنے دریاؤں کے اس کھیل تماشے سے بالکل غیر متاثر وقار سے کھڑے تھے۔ اوپر نیلے آسمان برابر کے بڑے بڑے پہاڑ، دھوپ میں چمکتے ہوئے متانت سے ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ قدرت کے ان بڑے بیٹوں کی نگاہوں میں آبشار کی تمام دوڑ دھوپ اور غل غپاڑہ صرف طفلانہ حرکتیں تھیں۔

آبشار ایک مستقل تماشا گاہ، ایک بڑا سا کارنیوال تھا جس کا ہر ہر حصہ بجائے خود ایک تماشا تھا اور مجموعی حیثیت سے انسان کو بھوچکا بنا دینے والا عجائب گھر۔ یہاں قدرتی

حسن اس کثرت سے تھا کہ دل موہ لینے سے پہلے دل کو اچنبھے سے بھر دیتا تھا۔ پانی تھا کہ چلا آ رہا تھا، چلا آ رہا تھا، چلا آ رہا تھا، رہ رہ کر خیال ہوتا تھا کہ یوں ہی آتا رہا تو کہیں ابھی ابھی ختم نہ ہو جائے۔ اسی طرح پانی کی ہر شکل یعنی انار، پھلجھڑی، چشمے اور دھارے کے بارے میں بھی دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ جلدی سے ان کا لطف لے لو۔ ورنہ کہیں یہ ختم نہ ہو جائیں۔ یہ خیال دماغ میں جگہ ہی نہیں پکڑتا تھا کہ یہ تماشا صدیوں سے یونہی چلا آ رہا ہے اور یوں ہی چلا جائے گا۔

آس پاس کی چٹانیں بے زبانی سے فریاد کر رہی تھیں کہ دیکھو زمانے نے پانی کے اور زار سے ہم کو گھستے گھستے بے حیثیت بنا دیا ہے۔ یقیناً ایک زمانہ ایسا ہو گا جب یہ آبشار اتنا بڑا نہ ہو گا یعنی جس سطح پر میں کھڑا تھا وہ اتنی نیچی نہ ہو گی۔ لیکن پانی کی چادر نے نیچے کی سطح کو توڑ توڑ کر اور پانی سے بنے ہوئے دریا نے اپنے نیچے کی زمین گھس گھس کر ایک غار بنا دیا اور اپنی تہ کو ڈیڑھ دو سو فیٹ اور نیچا کر لیا۔ کچھ چٹانیں اب بھی ویسی تھیں جو صدیوں کے مقابلے کے بعد بھی اپنا تھوڑا بہت وجود بچا لے گئی تھیں اور اب پانی سے سر نکالے گھمنڈ سے کھڑی تھیں۔ ان بچاریوں کو نہیں معلوم کہ مقابلے میں ہار جانے والا پانی اب آہستہ آہستہ ان کی جڑ کاٹ رہا تھا۔ وہ دن قریب ہے جب ان چٹانوں کو اپنے گھمنڈ پر شرمانا پڑے گا۔ مگر دن قریب ہے کا مطلب ہے تین چار ہزار برس —— کتنی لمبی ہوتی ہیں قدرت کی تاریخیں۔

آبشار کے گرنے سے فضا میں پھوار پڑ رہی تھی جو آس پاس کی گھاس اور پودوں کو تو مسلسل نہلا رہی تھی اور دور کے درختوں اور پودوں پر موتی نچھاور کر رہی تھی۔ اس پھوار نے روم کے پرانے حمام خانوں کی داستانیں مجھے یاد دلا دیں۔ میں نے چاروں طرف نظر

دوڑائی تو اردگرد کی ساری کائنات کا مالک و مختار میں ہی تھا صرف تنہا میں۔ میں نے کپڑے اتار دیئے اور کودتا پھاندتا، چٹانوں چٹانوں ہوتا پھوار کی طرف چلا۔ چٹانیں بھیگ بھیگ کر کائی سے ایسی ڈھک گئی تھیں جیسے جہیز و صندوقچے پر غلاف، ان پر چلنا اور ان کو پھاندنا بڑے ہی خطرے کا کام تھا جب میں نیچے آ رہا تھا تو نگہبانوں نے خبردار کر دیا کہ یہاں کی پھسلوان چٹانوں سے گر گر کر موتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے میں بہت احتیاط سے خطروں کا سامنا کر رہا تھا۔ دس منٹ میں میں پھوار کے بالکل پاس آ گیا۔ اب میرے اور گھنی پھوار کے درمیان میں صرف ایک گہری کھائی تھی جس میں دو تین چٹانیں ابھری ہوتی تھیں اور پانی ان کے گرد بہت غصے سے چکر مار رہا تھا۔ مجھے کھائی کو پار کر کے سامنے کی چٹان پر جانا تھا۔ درمیان کا فاصلہ ہو گا کوئی پانچ فٹ، لیکن سامنے کی چٹان پر اتنی کائی تھی کہ یہ بات بالکل یقینی تھی کہ اس پر پاؤں نہیں جمیں گے اور اس کے نیچے کی کھائی؟ وہ تھی تو بے حد حسین مگر اس سے گلے ملنا موت سے ہمکنار ہونا تھا ــــــ مگر کھائی کو نانگھنے کی ایک صورت تھی برابر کے پہاڑ سے ایک درخت جڑ پر سے کمزور ہو کر تقریباً ۷۰، ۸۰ ڈگری کا زاویہ بناتا ہوا چٹان پر جھک آیا تھا ــــــ اگر کود کر اس کو پکڑ لوں تو؟ ــــــ بالکل محفوظ ہوں۔ مگر دیکھنے میں درخت کی جڑ اتنی کمزور معلوم ہوتی تھی کہ ڈر لگتا تھا کہ کہیں میرا معمولی جھٹکا بھی اس کے لئے آخری ہچکی نہ بن جائے۔ یہ بھی ہمت کا کام تھا۔ لیکن اس منظر نے مجھ میں رابن کروسو اور ٹارزن کی اسپرٹ پیدا کر دی تھی۔ میں نے ہمت باندھ کر ایک جست ماری۔ سامنے کی چٹان پر پاؤں پڑتے ہی پھسلا۔ مگر درخت کی شاخ ہاتھ میں آ گئی اور اس نے سنبھال لیا اب میں پھوار کے بیچ میں تھا۔ اس نے فوراً مجھے اپنی بہت ٹھنڈی، ملائم، گدگدی بھری گود میں لے لیا۔ سانس تک میں تراوٹ آ گئی۔ میں نے سردی سے ایک سسکی

بھری اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ بات کی بات میں میرے بدن پر چاندی کے موتی پھیل گئے اور پھر انہوں نے ٹوٹ ٹوٹ کر مجھے نہلا دیا۔ مگر یہ لطف میں زیادہ دیر تک نہیں اُٹھا سکا کیونکہ سردی سے کانپنے لگا۔ اب واپسی کے لئے جلدی ہوتی کہ جب تک میں یہاں ہونگا چاہوں یا نہ چاہوں غسل جاری رہیگا۔ لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو واپسی محال نظر آئی۔ کیونکہ جس چٹان سے میں کود کر آیا تھا۔ اس کا ادھر والا رُخ اتنا ہی پھسلوان تھا جتنی یہ چٹان جس پر میں کھڑا تھا ــــ اور اس چٹان پر تھامنے کو درخت کا تنکا تک نہ تھا ــــ سب سے بڑی بات یہ کہ سردی سے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور سان پر قابو نہ تھا۔

اب تو میں ذرا گھبرایا کہ کیا کروں۔ پھوار میں روم کے تمام خانوں کا مزا ہو چا ہے ترکی کے حمام خانوں کا، یہ تو غیر ممکن ہے کہ زندگی بھر اسی میں کھڑا نہایا کروں۔ آخر خیال آیا کہ اگر یہ درخت مضبوط ہو تو اس پر چڑھ کر پہاڑ تک پہنچو اور پھر پہاڑ پر چڑھ کر پہاڑ تک پہنچو اور پھر پہاڑ پر چڑھ کر آبشار آنے والی سیڑھی تک اور اس سے اتر کر اپنے کپڑوں تک، راستہ بہت پیچیدہ، دشوار گذار اور دقت طلب تھا مگر تھا وہی ایک راستہ اب ایک سوال اور اُٹھا۔ کیا یہ درخت میرا بوجھ اُٹھا لے گا؟ اس کے امتحان کی ضرورت تھی۔ میں نے ایک جگہ چٹان میں پاؤں جما کر درخت کو خوب جھٹکے دیئے۔ اب سمجھ میں آیا کہ درخت جس کی جڑیں پتھروں کو جکڑے ہوئی ہوں لاکھ لٹ جانے پر بھی بہت ہوتا ہے۔ آخر ایسی حالت میں اُس نے جانے کتنی آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کیا ہو گا۔

جب میں آدھ گھنٹے کی سخت چڑھائی اتار طے کر کے آیا اور کپڑے پہن کر

سستانے لگا تو میرا تخیل اپنی عادت کے مطابق پہاڑوں پر آوارہ گردی کرنے لگا وہ پہاڑ سے آنے والے، سامنے کے دریا پر چڑھنے لگا اور چڑھتے چڑھتے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور کہیں ایک پنگھٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں پہاڑی دوشیزائیں پانی بھر رہی تھیں (یہاں دوشیزائیں - ہم اوسط طبقے کے نوجوانوں کو انسان صرف اسی روپ میں نظر آتا ہے) کیا تندرستی! کیا حسن! کیسی پھرتیلی چال ڈھال! کیسی آزاد زندگی!....

میں چونک پڑا ——— تخیل نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا کاش کسی طرح اس زندگی میں کھپ کر اس کی حقیقت معلوم کر سکتا۔

پھر انہیں منڈلاتی ہوئی سیڑھیوں کو طے کر کے اوپر واپس آگیا۔ چار انڈوں اور دو پیالی چائے کی اپنی تکان کو نذر دی۔ ذرا آرام کیا اور پھر اپنے پاس کے مندر کو دیکھنے گیا۔ مندر کی چھت کے سامنے والا دریا دور تک نظر آتا تھا۔ وہ دریا چڑھتا ہوا پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا تھا۔ اس پہاڑ کے اوپر سبز سبز درختوں کے جھنڈ میں کچھ لال لال دھبے سے نظر آرہے تھے۔ یہ ایک گاؤں کے کھپریل تھے۔ گاؤں کی ان نشانیوں نے میرے آوارہ تخیل کو بالکل موہ لیا۔ وہ پنگھٹ، وہ رابن کروسو، وہ ٹارزن، وہ للچانے والی زندگی سب یہیں نظر آنے لگی۔ میرا ارادہ لاری سے واپس جانے کا تھا۔ اس کے آنے میں ابھی ڈھائی گھنٹے باقی تھے اور سامنے والا گاؤں ہوگا کوئی چھ سات میل۔ جس رفتار سے میں آیا تھا اس حساب ہوگا بائیسکل کا کوئی دو گھنٹے کی آمد و رفت کا راستہ ہے۔ میں زیادہ غور کئے بغیر چل کھڑا ہوا اپنے تخیل کے خوابوں کی زندہ تعبیر دیکھنے۔

اس گاؤں کے راستے کا آدھا حصہ تو ایک پہاڑ کی زبردست ڈھال تھا اور

آدھا دوسرے پہاڑ کی زبردست چڑھائی۔ مگر راستہ ایسا تھا جو بول رہا تھا کہ مجھے بہت کم انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ پگڈنڈی پر جا بجا گھاس تھی۔ بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے اور کہیں کہیں تو راستہ ایسا تھا جیسے راستہ کہنا ہی غلط ہے۔ وہاں درختوں کی شاخیں اتنی جھکی ہوئی تھیں کہ بائیسکل کا نکالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ہر قدم پر یہ ڈر تھا کہ کہیں کوئی درندہ نہ نکل آئے۔ ہوتے ہوتے یہ ڈھال ایک شور مچانے والی ندی پر ختم ہو گئی۔ یہی ندی تھی جو آگے چل کر آبشار والا دریا بن گئی تھی۔ اس کے پار کرنے کیلئے ایک درخت کے تنے کا پل تھا اور اس کے بعد دوسرے پہاڑ کی چڑھائی میں نے بڑی ترکیبوں سے اور بڑی محنت سے بائیسکل پھندھائی اور پھر چڑھائی شروع کی۔ جب میں آدھا پہاڑ طے کر چکا تب پتہ چلا کہ وہ گھنٹے جو میں نے آمد و رفت کیلئے سوچے تھے ختم ہو چکے ہیں ——

اب کیا کروں؟ واپس جاؤں تو لاری ملنے سے رہی۔ رات کو اندھیرے میں بائیسکل پر ۲۳ میل طے کر کے رانچی پہنچنا تو ناممکن بات ہے۔ راہ میں درندوں کے خطرے بھی ہیں اور سب سے بڑا درندہ وہ زبردست چڑھائی ہے۔ جس کی اتار میں نے ساٹھ میل فی گھنٹہ کے حساب سے طے کی تھی۔ خیر، رانچی پہنچنا تو بعد کی بات ہے۔ اب شام ہو رہی ہے۔ ایسی حالت میں چا کی دکان تک پہنچنا آسان نہیں۔ لیکن اگر واپس نہ جاؤں تو کروں کیا؟ آخر یہ سمجھ میں آیا کہ سامنے کے گاؤں ہی کو چلو اور وہاں سے کچھ آدمی لے کر چا کی دکان واپس چلو اور وہاں رات کاٹو،

جب میں پہاڑ کے اوپر پہنچا ہوں تو نیچے ایک وادی کی چٹانوں میں سورج اپنا آدھا منہ چھپا چکا تھا، جتنا اوپر تھا وہ سیدھی پلکوں میں گھری ہوئی شرماتی آنکھ کی طرح

مجھے تاک رہا تھا۔ کرنیں درختوں کے پتوں سے اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ پہاڑی گاؤں کے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک غول اچھل کود اور شور غل میں ڈوبا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بھی سورج ڈوبنے ہی کا اہتمام ہے۔ یہ لڑکے لڑکیاں چھ برس سے لیکر چودہ برس کے سن تک کے تھے اور سب کے سب تقریباً بالکل ننگے تھے۔ صرف بعض لڑکیوں نے کچھ چیتھڑے جانگھیا کی طرح اپنی کمر اور رانوں پر لپیٹ رکھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مجمع میں ہراسگی اور افراتفری پھیل گئی۔ سب کے سب ٹھٹھک گئے۔ پھر بڑی لڑکیاں درختوں کی آڑ میں چھپ گئیں اور وہاں سے مجھے جھانکنے لگیں۔ ایک چھ برس کا لڑکا بسورنے لگا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ کہ میں نے گاؤں میں اپنی اس وضع میں آکر کیسی بھاری غلطی کی۔ ان لوگوں میں میں اپنے سفید کپڑوں، ہیٹ اور بائیسکل کی وجہ سے انسان نہیں، انسان سے کچھ برتر معلوم ہوتا تھا۔۔۔۔ ان لوگوں کی پریشانی دیکھ کر میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ مگر اب یہ سب بچے ذرا فاصلے سے میرے پیچھے پیچھے لگ گئے۔ نئے گاؤں اونٹ آیا۔

سورج پلک مار کر چھپ گیا اور مشرقی آسمان نے سرمئی چادر اوڑھ لی۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ سامنے ایک جوان مرد اور ایک جوان عورت جو غالباً اُس کی بیوی تھی۔ دونوں پہاڑ کی ڈھال پر پتھر جما جما کر مٹی ڈال رہے تھے۔ یعنی اپنے لئے کھیت بنا رہے تھے۔ دونوں کے جسم پر لباس کے نام کو ایک ایک چیتھڑا تھا جو لنگوٹ کی طرح بندھا تھا۔ عورت کے گلے میں وہ چیتھیں اور بھی تھیں جو گلے سے جھول رہی تھیں۔ ایک عبث میں چند کاج سے بنے تھے جو گھمنڈ سے بتا رہے تھے کہ ہم بھی تھے کسی زمانے میں کرتہ قمیص یا کرتی کے قسم کی کوئی چیز۔ مگر اب یہ چیتھیں اپنے مالک کے بدن کا کوئی حصّہ بھی نہیں ڈھانک سکتی تھیں۔ عورت کی چھاتیاں بہت لاپروائی سے غیر نگاہوں کا سامنا کر رہی

تھیں۔ مجھے دیکھ کر عورت کو شرم آئی اور اُس نے ان جثوں کو چھاتیوں پہ لا کر ان کا ذرا سا حصّہ چھپا لیا۔ اس جوڑے نے مجھے جو دیکھا تو ان کے ہاتھ کام سے رک گئے اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں چپکے سے ان کے نوزائیدہ کھیت کی مینڈ پہ بیٹھ گیا اور ان لوگوں سے کہنے لگا کہ میں گوتم آبشار سے پہاڑوں میں گھومتا گھومتا ادھر آنکلا ہوں۔ اب رات ہو رہی ہے۔ اس لئے جب تک چھ سات آدمی اور روشنی ساتھ نہ ہوں واپس نہیں جا سکتا ہوں ــــ

بہت دیر کے بعد اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد ان لوگوں کی جھجک گئی۔ اب وہ دونوں میرے دوست تھے۔

(۴)

ایک بہت چھوٹے سے کھپریل کے اندر، جس میں دس بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ مشکل ہی سے نکل سکتی تھی، میں گاؤں والوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ مٹی کے تیل کا ایک چراغ جل رہا تھا۔ اس کی لو ہلکی ہوا میں ہل ہل کر سامنے بیٹھنے والوں کے چہروں پر دھوپ چھاؤں پیدا کر رہی تھی۔ سامنے کچھ مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے بھڑے بیٹھے تھے۔ ان کی گود میں بچے تھے۔ کچھ لوگ جگہ کی کمی کی وجہ سے دیواروں سے لگے کھڑے تھے، دروازے میں اور دروازے کے باہر بھی مجمع تھا ــــ یہ سب میرے لئے تھا

میرے نئے دوست نے مجھے حکم دیا تھا کہ رات یہیں کاٹو ــــ یہ حکم ایسا تھا جیسے کوئی دوست کسی مریض کو دے۔ اس کی تعمیل کر کے مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ تعمیل کے سوا چارہ بھی نہ تھا کیونکہ راہ کا خطرناک جنگل رات کو بلا دس بارہ آدمیوں اور جلتی مشعلوں کے طے نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس جلوس کا یہاں انتظام ہونا ناممکن

تھا۔

جیسے چھوٹے موٹے کھپریل میں میں بیٹھا تھا، گاؤں میں ایسے ویسے ۲۰۰۵ کھپریل تھے اور کل آبادی دو ڈھائی سو۔ سب کا لباس اسی قسم کا تھا یعنی تقریباً برہنہ۔ صرف دو تین مرد اور عورتیں پورے کپڑوں میں تھے۔ یو، پی کے دیہاتوں میں انتہائی غریبی پر بھی دیہاتی گھروں میں پھول کی لٹیا اور تھالی تو نظر آ جاتی تھی۔ یہاں وہ بھی نایاب تھی۔ یہاں غریبی اور صرف غریبی کا راج تھا۔ اس کے سنگی ساتھی بھی تھے یعنی بیماریاں جس میں کھانسی، گٹھیا، جوڑی بخار بہت عام تھے۔ آپس کی لڑائیاں، حد سے زیادہ ضعیف الاعتقادی اور جہالت بھی یہاں مٹی کا تیل، بیڑی، صابن، جوتا، چوڑیاں، ٹاٹ کا بستر ہر چیز بہت بڑی نعمت تھی۔ دیا سلائی کی ایک تیلی ادھار دی جاتی تھی اور اس کے واپس نہ ملنے پر مار کٹائی ہو جاتی تھی اور ہاں اس گاؤں میں سود خوار بھی تھے۔ ایک بنیا اور دوسرا گھوسی جس کے پاس دو بھینسوں کی وسیع جائداد تھی

کھانا میرے سامنے جو آیا وہ وہاں کی سب سے بڑی دعوت تھی۔ اُبلی ہوئی چھوٹی جوار چاول کے طور پر، جوار کی ایک ٹکیا، کسی درخت کی اُبلی ہوئی جڑ کا بھرتا جس میں صرف نمک مرچ تھا اور بہت بڑی نعمت کے طور پر ذرا سے چاول۔

یہ لوگ کالے تھے۔ بال کالے ملائم اور چمکدار۔ بہت تیز رنگت کی سیاہ آنکھیں جس میں عجب کشش تھی۔ پکے فالسوں کے ایسے ہونٹ، ان انسانوں میں حسن تھا مگر اس حسن کی تشبیہہ باغوں اور چمنوں کی کسی چیز سے نہیں دی جا سکتی ہے۔ ان میں پہاڑوں کی عظمت اور وحشی آبشاروں کی نزاکت تھی۔ ممکن ہے ٹھیٹ شہری نگاہ کو وہ نہ بھائے، لیکن جس کی نگاہ میں ذرا بھی وسعت ہو گی۔ اُس کے دل میں یہ حسن ضرور گھر بنائے گا ــــــ مگر صدیوں کی

نیم فاقہ کشی، بے تکان جفاکشی نے چہروں پر ایسی گلکاریاں بنائی تھیں کہ چہرے بے رونق آنکھیں بے اثر اور جسم مرجھائے ہوئے تھے صحت اور حسن کی جان یعنی امید کا ان میں پتہ نہ تھا۔ ان کے سامنے زندگی ایک بے آس مسلسل سفر تھا اور بس۔ یہ بات بھی نہیں کہ وہ لوگ خوش نہ رہتے تھے۔ خوش تھے اور تہواروں پر باقاعدہ خوشیاں مناتے تھے، گاتے تھے، ناچتے تھے اور سوانگ بھرتے تھے مگر ایسی خوشیاں جو سخت ضروریات زندگی کے قحط، بیماریوں اور فکروں کے میل پر مبنی ہیں ہمیشہ مار کٹائی پر ختم ہوئیں چھوٹی خوشیوں میں یہ طاقت کہاں کہ دل کو ایسا مست کردیں کہ دوسروں کی کمزوریاں اور شرارتیں بھی اس پر اثر نہ کریں۔

میں نے ان لوگوں میں آس پیدا کرنا چاہی۔ ان کو آزادی کا پیام پہنچایا۔ آنے والے انقلاب کا مژدہ دیا۔ وہ لوگ غور سے میری باتیں سن رہے تھے۔ بچے نیند سے جھوم رہے تھے مگر پھر بھی وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کا پیام ان کو پہنچ چکا تھا۔ ان میں سے ایک شخص جیل بھی جاچکا تھا مگر ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ آزادی کا ان کی روزمرہ کی زندگی سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ اُن کو آزادی سے کچھ امیدیں تھیں مگر مبہم۔ جب انہوں نے آزادی کا مطلب سنا تو ان کی خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مگر اس حیرت اور خوشی میں یقین کا شائبہ تک نہ تھا۔ میں گویا الہ دین اور چراغ کی کہانی سنا رہا تھا اور وہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ اگر کہیں ہم کو مل جائے وہ چراغ ——!

رات زیادہ آگئی تو لوگ رخصت ہوئے۔ میرے میزبان نے اپنا سارا گھر یعنی وہ کھپریل میرے واسطے خالی کردیا اور خود چار بچوں اور ایک بوڑھی ماں سمیت کہیں اور جانے لگا۔ اتنے بڑے گھرانے کے رہنے سہنے، بچے پیدا ہونے اور تمام باتوں کے لئے صرف یہی اتنا سا گھر تھا۔ دیواریں تو لوگ چاہے جتنی اٹھالیں مگر چھانے کے لئے کھپرے نہیں مل سکتے تھے۔ ان

جھونپڑیوں کے بھی جہاں جہاں کھپرے ٹوٹ گئے تھے۔ وہ جگہ ترپن اور چھالوں سے ڈھکی گئی تھی۔

میرے میزبان اس قدر خوش تھے کہ میرا ایسا سفید پوش بانونی شہری ان کا مہمان ہوا ہے کہ بچھے جا رہے تھے۔ ان غریبوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میری آرام اور خوشی کے لئے کیا کریں۔ میں ان کی خاطرداریوں سے پریشان ہوا جا رہا تھا مگر پھر بھی سب قبول کرتا چلا جاتا تھا کہ میزبان کی دلشکنی نہ ہو۔ جب میزبان جانے لگا تو اس نے اپنی بیوی کو میرے پاؤں دبانے کے لئے چھوڑنا چاہا میں نے لاکھ منع کیا مگر وہ نہیں مانا۔ آخر جب میں سوتا بن گیا تب وہ دونوں جھونپڑی کا دروازہ باہر سے خوب مضبوط بند کر کے (شاید درندوں کے ڈر سے) چلی گئی۔

جھینگر چلا رہے تھے اور دور پر بھیانک آوازوں میں درندے چیخ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں نیند کا پتہ نہ تھا دیکھ لئے پہاڑوں کے بسنے والے۔ یہ ہے تعبیر میرے رانجن کروسو، ٹارزن اور پہاڑی دوشیزاؤں کے خوابوں کی ——— اس وقت مجھے اکبارگی راجہ صاحب اپنی رنڈیوں، مصاحبوں، لڑکے اور کتے سمیت یاد آ گئے۔ وہ ویسی ہی حماقت کی باتیں کر رہے تھے بے تکے قہقہے لگا رہے تھے اور رنڈیاں اور راجہ صاحب انکی ہنسی میں سنگت کر رہے تھے۔ پھر وہ خالی مکان یاد آیا جو راستے میں ملا تھا۔ پھر راجہ صاحب معہ اپنے لاؤ لشکر کے اس مکان میں آکر بس گئے ——— روپیہ پیسہ تو خدا کی دین ہے جس کو دے دے اُدے دے۔ راجہ جیسا بھی ہو خدا نے اس کو دھن دیا ہے اور ان دو سو محنتی سمجھدار انسانوں کو نہیں دیا۔ خدا کی دین کیوں؟ حکومت کی دین کیوں نہیں؟ کب ہندوستان آزاد ہوگا اور کب یہ غریبی جائے گی؟ کاش وہ دن جلد آئے جب

اس دیہات میں آؤں تو یہاں کے سب باشندے سفید پوش ہوں، کھاتے پیتے ہوں، سماجی ترقیوں میں حصہ لیتے ہوں۔ یہ ننھے ننھے ۲۵ جھونپڑے پھیل کر بڑے بڑے پختہ مکان ہو جائیں۔ یہاں اسکول ہوں، پارک ہوں، سینما گھر ہوں، لوکل بورڈ کی عمارتیں ہوں، ڈاکخانہ ہو، ریل ہو، سڑک ہو ـــــ آہ اس منظر کو ایک نظر، صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے انسان کیا کچھ نہیں قربانی کر سکتا ہے۔

دس بجے صبح جب میں واپس آ رہا تھا تو میری گردن پر میرے رومان کی بھاری لاش تھی۔ شرم سے میں انسانیت کے سامنے سر جھکائے ہوتے تھے۔ میں ہندوستان کی غریبی جانتا تھا۔ اپنے کو غریبوں کی جماعت کا علمبردار سمجھتا تھا۔ اس پر بھی دماغ میں پہاڑ کے بسنے والوں کے لئے ایسے سنہرے سپنوں کی دنیا بنا رکھی تھی۔ کچھ حد ہے بھول کی! دماغ پشتوں کی روایتوں اور غلط تعلیم سے لاکھ نکلنے کی کوشش کرے۔ پھر بھی پھنس ہی جاتا ہے۔

انوپ نگر

کسی اونچے پربت کی چوٹی پر ایک دیس تھا، جسے انوپ نگر کہتے تھے وہاں کا راجا ہر طرح کے دھن دولت سے بھرپور تھا اور دیالو ایسا تھا کہ اسکے دان پن کی خبریں دور دور پھیل چکی تھیں۔ پرجا پر اس کا ایسا دباؤ تھا کہ اگر وہ کسی سے کہتا کہ آگ میں کود پڑو تو بات بھی پوری نہ ہونے پاتی اور وہ آگ میں کود پڑتا

ایک نوروز کو جب سورج کی تازہ تازہ کرنیں انوپ نگر کے بڑے مندر کے سونے کے کلس کو چوم رہی تھیں اور پجاری کا سنکھ آکاش سے ٹکرا رہا تھا۔ راجا نہا دھوکر سونے کی کھڑاویں پہن دربار میں آیا۔

راجا کا دربار نورتن دربار تھا۔ سنگھاسن کے ایک طرف بڑے بڑے سورما مونچھیں چڑھائے، کاندھوں پر کھانڈے دھرے، اپنی طاقت کے گھمنڈ میں

مست کھڑے ہاتھی کی طرح جھومتے تھے۔ ان سب میں رعب دار چہرہ کوتوال کا تھا جس کی دونوں مونچھیں بھالوں کی طرح تھیں اور آنکھیں چنگاریوں کی ایسی
سنگھاسن کے دوسری طرف ایسے ایسے شاعر اور داستان گو تھے۔ جن کی نظمیں تاروں کی طرح سننے والوں کے دلوں میں چمکتی تھیں اور جن کی کہی ہوئی کہانیاں لوگوں کو رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں کی طرح یاد رہتی تھیں۔ ایسے ایسے گویّے تھے۔ جن کی آواز کوئل سے زیادہ رسیلی اور پپیہے سے زیادہ شیریں تھی۔ یہ سب ہنسوں کی طرح سورماؤں کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔

راجہ نے آکر ہیرے جواہرات کے سنگھاسن پر پاؤں رکھا سنگھاسن جگمگا اُٹھا۔ دربار کا گھنٹہ بجا، سنکھ پھنکا اور سامنے کا پردہ ہٹا۔ پردے کے اس پار پرجا کی بھیڑ تھی جو اپنے سوامی کا درشن کرنے آئی تھی۔

ان کی دھوتیاں میلی اور آنکھیں گندی سہی۔ لیکن جیسے ہی اُنہوں نے راجا کے مکھڑے کو دیکھا جو موتیوں کے مالا کے بیچ میں اس طرح کھلا ہوا تھا جیسے تالاب میں کنول کا پھول، ان کے دل کی اُداسی چلی گئی اور جیون کی کلی کھل گئی۔ جے جے کے شور سے آس پاس کے سب پہاڑ گونج اُٹھے۔

راجا نے سنگھاسن پر بیٹھتے ہی جوتشی جی کی طرف دیکھا جو صندل کی چوکی پر مرگ چھالا بچھائے براجمان تھے۔ جوتشی جی نے پرنام کیا اور کھڑے ہو کر کہا "آگیا مہاراج کی؟"

راجا نے کہا "جوتشی جی، اب تک تمہاری بتائی ہوئی سب باتیں پوری اُتریں اب بتاؤ کہ اس سال تو کوئی مصیبت نہیں آنے والی ہے؟"

جوتشی نے ایک لمبے کاغذ کو جو لپٹا ہوا اُن کے ہاتھ میں تھا زمین پر لڑھکا دیا۔ وُہ کھلتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس پر یہاں سے وہاں تک طرح طرح کی شکلیں اور زائچے بنے ہوئے تھے۔ جوتشی نے عینک ناک کی نوک پر کھینچ لی اور غور سے ان شکلوں کو دیکھنے لگا۔ پھر سر اُٹھا کر بولا۔

"مہاراج، کل اکیلے میں بتاؤں گا۔"

دوسرے دن ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ جوتشی نے آکر راجا اور رانی کے پاؤں چھوئے اور کہنے لگا۔

"مہاراج اور مہارانی۔ ستاروں کی خبر اچھی نہیں ہے —— وُہ کہتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد اس نگر میں رات بھر پانی برسنے لگا۔ وُہ پانی دیکھنے میں موتی، سونگھنے میں چنبیلی اور پینے میں زہر ہوگا۔ اس پانی کی ایک بوند بھی جس برتن میں پہنچ جائے گی۔ اس کا سارا پانی زہریلا ہو جائے گا۔ اس پانی کی چمک اور مہک لوگوں کے دلوں کو موہ لے گی۔ مگر اُس کو جو پیئے گا۔ وُہ پاگل ہو جائیگا۔

یہ بات سُن کر رانی ہنس پڑی۔ بن بیدھے موتیوں کی لڑی دمک اُٹھی اور چاندی کے گھنگھروؤں کی ایسی جھنکار ریشمی پردوں سے ٹکرا ٹکرا کر سنگ مرمر کے کمرے میں گونج اٹھی۔ رانی نے کہا۔

"ہم کو اس بات سے بھلا کیا ڈر۔ میں آج ہی حکم دیتی ہوں کہ ہمارے لئے ایک حوض پانی سے بھر لیا جائے اور اس پر پہرا بٹھا دیا جائے۔"

رانی کی ہنسی نے راجا کے من کی چنتا دور کر دی اور اس کی بتائی ہوئی تدبیر دل کو بھا گئی۔ اُس نے فوراً حکم دیا کہ سات کمروں کے بیچوں بیچ چاندی کا

ایک حوض بنایا جائے اور صاف ستھرے پانی سے بھر کر ساتوں کمروں کو بند کر دیا جائے اور اس پر پہرہ بٹھا دیا جائے۔

راجا کا دربار روز لگتا۔ شاعر نظمیں سناتے۔ ناٹک لکھنے والے ناٹک دکھاتے اور گویے اپنی سُریلی تانوں سے پربت کی چوٹیوں اور ان کے گرد چکر مارنے والے شکاری پرندوں کو مست بنا دیتے۔ یوں ہی دن بیتتے گئے اور جوتشی کی بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک دن تڑکے تڑکے راجہ کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہے کہ بادلوں کے کچھ ٹکڑے روئی کے گالوں کی طرح پہاڑ کی کھردری چٹانوں کے اُوپر ہوا میں اُڑے اُڑے پھر رہے ہیں۔ سورج کی رنگ برنگی کرنیں ان سے اٹھکیلیاں کر رہی ہیں۔ ہوا کے جھونکے ایک نرالی مہک لئے آ رہے ہیں اور بدن کو گدگدا رہے ہیں یہ سماں کچھ ایسا منموہن تھا کہ راجا رات کا بھیانک سپنا بالکل بھول گیا۔ اسکی آنکھیں بادلوں کی منوہر لیلا میں کھو گئیں اور دھیان ہوا کی مہک سے مست ہو گیا

راجہ بہت دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہا

اس دن راجہ کے نوکر کی آنکھ ذرا دیر میں کھلی تھی وہ گھبرا کر اُٹھا۔ اٹھا ہی تھا کہ دھلے ہوئے نیلے آسمان اور بادلوں کے ٹکڑوں نے بتایا کہ رات کو پانی برسا ہے کھردری چٹانوں کے دیس میں تازہ پانی!! کتنی بڑی نعمت ہے!! نوکر خوش خوش اٹھا اور باہر آ کر اپنے حوض کو دیکھا۔ اس میں رات کا پانی موتی کی طرح

چمک رہا تھا اور چنبیلی کی طرح مہک رہا تھا۔ نوکر نے جلدی جلدی گڑ کی ایک ڈلی کھائی اور پھر کٹورا بھر پانی پی گیا۔

راجا نوکر کی آہٹ پا کر چونکا۔ اُسے خیال آیا کہ دربار کو دیر ہو رہی ہے اُس نے نوکر سے کہا کہ جلدی سے کھڑاویں اُٹھا لاؤ۔ نوکر تو پانی پی کر پاگل ہو چکا تھا۔ وہ یہ بات سُنکر بہت ہنسا اور کہنے لگا۔

"تم نہ میری کھڑاویں اُٹھا لاؤ"

اپنی شان میں یہ بات سنتے ہی راجہ آگ بگولا ہو گیا۔ کیونکہ زندگی میں پہلی بار راجہ نے ایسی بات سُنی تھی۔ نہ ہوتا پاس کھانڈا ورنہ نوکر کا سر اڑا دیتا۔ مگر راجہ نے طے کر لیا کہ اس کو زن بچے سمیت کولہو میں پلوا دوں گا تاکہ دوسروں کو سبق ہو اور پھر کوئی ایسی گستاخی نہ کرے۔

راجہ نے غصے میں اپنے سپاہیوں کو پکارا۔ آواز سُن کر دو چار سپاہی اندر آ گئے مگر آئے ایسے کہ جیسے باغ میں ٹہل رہے ہوں۔ جھومتے جھامتے، ہنستے کھیلتے، ایک دوسرے کو گدگداتے اور چھیڑتے ہوئے۔

راجہ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اُس نے ڈانٹ کر کہا۔

"تم سب میرے محل سے نکل جاؤ"

یہ سُن کر سب اس طرح کھل کھلا کر ہنسے جیسے کوئی بھانڈوں کی نقل پر ہنسے اور پھر سب آواز ملا کر یہ گانے لگے اور تانیں مارنے لگے

نکل جاؤ تم خود ہمارے محل سے ہمارے محل سے ہمارے محل سے

راجا اچنبھے میں بت بن گیا۔ اس وقت اس میں اور کمرے میں کھڑی ہوئی چاروں مورتیوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ بچارا راجہ گھبرایا ہوا اٹھا اور ننگے پاؤں رانی کی طرف چلا۔ راستے میں دیکھتا کیا ہے کہ محل کی داسیاں اور خواصیں بھی اسی حالت میں ہیں۔ ہنس رہی ہیں۔ کہیں کوئی سوانگ بھر رہی ہے، کہیں کوئی ناچ رہی ہے، تھرک رہی ہے۔ راجہ جوان کے پاس سے گزرا تو ایک خواص کی اس پر نظر پڑ گئی۔ وہ کہنے لگی

"ارے راجا آیا راجا۔ واہ وا راجا۔"

یہ سنتے ہی سب داسیاں راجا کے گرد جمع ہو گئیں اور کہنے لگیں

"اے راجا رے راجا ذرا ناچ دے۔ میرے راجہ ذرا ناچ دے۔"

راجہ ان سے پیچھا چھڑا کر رانی کے کمرے میں آیا۔ دیکھا تو وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہکا بکا بیٹھی ہوئی ہے۔ راجہ نے رانی کی طرف دیکھا اور رانی نے راجہ کی طرف دیکھا کسی کے منہ سے کوئی بول نہ پھوٹا۔ دونوں سناٹے میں بیٹھے رہے۔ کچھ دیر کے بعد راجہ کو یاد آیا کہ کوتوال کو بلا کر ان سب کو سزا دلانا چاہتے۔ راجا نے ہاتھ بڑھا کر خطرے کی ڈوری کھینچی اور اتنے زور زور سے جھٹکے دئے کہ ڈوری ٹوٹ گئی۔

آج کوتوال کی آنکھ بہت دیر کو کھلی۔ اس نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا۔ اس کی استری نے جل پان کا تھال لا کر سامنے رکھا۔ اس میں ایک طرف ایک چاندی کے کٹورے میں تازہ پانی تھا جو موتی کی طرح چمک رہا تھا اور چنبیلی کی طرح

مہک رہا تھا۔ کوتوال نے مٹھائی اور پھل سے پہلے پانی کے کٹورے پر ہاتھ بڑھایا۔ مگر ابھی کٹورا ہونٹوں تک نہ پہنچا تھا کہ محل کے خطرے کی گھنٹی بجی۔ کوتوال کے ہاتھ سے کٹورا چھوٹ گیا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ یہ گھنٹی بجی۔ کوتوال نے ناشتہ چھوڑ جلدی جلدی کپڑے پہنے اور باہر آ کر سائیس کو حکم دیا کہ جلدی سے میرا گھوڑا کس لاؤ۔

سائیس نے یہ حکم پاتے ہی زین تو اٹھا لیا مگر اس کو لے کر گھوڑے کی طرف نہیں گیا مگر سیدھا کوتوال کے پاس آ کر اس کی پیٹھ پر زین رکھنے لگا۔ کوتوال نے سخت غصہ میں آ کر ایک تھپڑ مارا اور کہا۔

"ہوش میں ہے تو؟"

نوکر تھپڑ کھاتے ہی کود کود کر تالیاں بجانے لگا۔ اس کی آواز سن کر کوتوال کے سب نوکر ناچتے تھرکتے آ پہنچے۔ اب تو کوتوال نے لاکھ ڈانٹا دھمکیاں دیں لیکن ان پاگلوں پر ذرا اثر نہ ہوا۔ ان میں سے تین چار نے مل کر کوتوال کو پکڑ کر جھکا دیا اور دوسرے نوکروں نے اس کی پیٹھ پر زین کسا اور منہ میں لگام دی۔ پھر اس پر ایک لڑکے کو بٹھا کر کوتوال کو ہنکاتے ہوئے بازار کی طرف لے چلے۔

اس وقت تک سارا روپ نگر موتی کی چمک اور چنبیلی کی مہک والا پانی پی کر پاگل ہو چکا تھا۔ امیر غریب، بوڑھے بچے، مالک نوکر سب کے سب سڑکوں پر گاتے تھرکتے، ہنسی مذاق کرتے گھوم رہے تھے۔ کسی کو نہ تو دربار کی حاضری کی فکر تھی اور نہ راجہ کے درشن یا مندر کے پوجا کا دھیان۔ آج دربار کا

گھنٹہ اور مندر کا سنکھ خاموش تھے۔ کیونکہ بجانے والوں کو اب ان باتوں کا ہوش نہ تھا۔

ان لوگوں نے جو کوتوال کو اس ڈھنگ سے آتے دیکھا تو لگے اچھلنے کودنے ایک لڑکا آم کی گٹھلی کا پپیرا لئے۔

"آم کا نام کا، کلیا ببول کا، ہمیرا پپیرا بولے بھٹ پیں، بھٹ پیں" کرتا گھوم رہا تھا۔ اس نے جو یہ لیلا دیکھی تو کوتوال صاحب کے آگے پپیرا بجاتا ہوا چلا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ساری خلقت چلی۔

راجہ کو بیٹھے بیٹھے پیاس لگی۔ اس نے رانی سے پانی مانگا۔ اب رانی پانی لائے تو کیسے لائے۔ اس بچاری نے کبھی اپنے ہاتھ سے پانی پیا ہوتا تو جانتی کہ گھڑے کہاں رکھے ہیں۔ راجہ کی بات سنکر اس کی جامن ایسی آنکھوں میں آنسوؤں کی گھٹا گھر آئی اور جب اس نے مجبوری کی نظروں سے راجا کی طرف دیکھا۔ راجہ نے ٹھنڈی سانس لے کر سر جھکا لیا اور سوچنے لگا کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہو گیا۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا:۔

"چلو رانی جوتشی سے چل کر پوچھیں کہ یہ آفت ہے کیا۔"

راجا اور رانی دونوں مندر کی طرف چلے۔ سواری کو نہ ہاتھی نہ سکھ پال۔ اور جلو میں نہ سپاہی اور نہ چوب دار۔ راستے میں راجا اور رانی کی نگاہ کوتوال پر پڑی۔ اس کو اس عجیب و غریب حال میں دیکھ کر رانی اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ وہ دیو جس کے نام سے کل سارا نگر کانپتا تھا۔ آج یوں لوگوں کی بھی گھوڑی بنا ہوا ہے۔ کوتوال نے حسرت بھری نظروں سے راجا اور رانی کی طرف دیکھا

مگر اس کے منہ میں لگام تھی۔ اس لئے کچھ نہ کہہ سکا۔

مندر کے اندر بھی وہی تھا جو مندر کے باہر تھا۔ پوجا پاٹ کا وقت گزرا جا رہا تھا مگر گھنٹہ خاموش پڑا تھا۔ دوسری طرف سنکھ اوندھا پڑا تھا۔ آج مورتی پر نہ کسی نے صندل لگایا تھا اور نہ پھول چڑھائے تھے۔ صرف ایک بھٹکی ہوئی ابابیل پتھر کی مورتی کے گرد منڈلا رہی تھی۔

راجا اور رانی نے مورتی کو پرنام کیا اور جھک کر چرن چھوئے۔ راجہ نے پرارتھنا کی "اے بھگوان۔ ابھی کل تک ہمارا دیس آدمیوں سے بسا تھا لیکن آج چاروں طرف پاگل ہی پاگل دکھائی دے رہے ہیں"

راجہ کا گلا بھر آیا۔ رانی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں ٹپکنے لگیں اور مندر کی پتھر کی زمین میں جذب ہونے لگیں۔

راجہ نے پھر کہا

"یہ دیس اگر پھر ویسا نہیں ہو سکتا ہے جیسا تھا تو اے بھگوان، تو اسے جلا کر بھسم کر دے۔ یہ سب پاگل جل جائیں اور میں ان کے ساتھ اسی چتا میں جل جاؤں"

راجہ اور رانی جوتشی جی کے استھان کی طرف چلے۔ یہاں ابھی تک سورج کی روشنی نہیں پہنچی تھی۔ جوتشی جی گھی کا چراغ جلائے اپنی پوتھی کھولے کسی زائچے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ باہر شور اور ہنگامہ تھا۔ لیکن یہاں سناٹا تھا۔

راجہ اور رانی دبے پاؤں جوتشی جی کے پاس گئے۔ رانی بولی۔

"جوتشی جی پرنام"

جوتشی جی چونک پڑے اور جلدی سے کھڑے ہو کر دونوں کے پاؤں چھوئے

پھر ان دونوں کو اپنی جگہ پر بٹھایا اور خود ان کے سامنے ادب سے بیٹھ کر پوچھا۔

"کیا آ گیا ہے مہاراج اور مہارانی کی؟"

راجہ اور رانی کے دل کو یہ دیکھ کر ذرا اطمینان ہوا کہ اسی اندھیر نگر میں ایک آدمی تو ایسا ہے جو ابھی تک پاگل نہیں ہوا ہے۔ راجہ ذرا مسکرا کر بولے۔

"مہاراج آپ کو بسنت کی خبر ہی نہیں؟"

جوتشی جی نے کہا "سب خبر ہے مہاراج جی اور مہارانی جی۔ رات کو وہی منحوس پانی برسا ہے اور اسی کو پی پی کر سب پاگل ہو گئے ہیں۔"

رانی نے پوچھا۔

"ان لوگوں نے کیوں نہیں پہلے سے پانی حوضوں میں بھر والیا تھا؟"

جوتشی نے جواب دیا۔

"مہارانی جی غریب پرجا نہ حوض بنا سکتی تھی اور نہ اتنا پانی اکٹھا کر سکتی تھی۔"

راجہ نے کہا

"یہ بتاؤ جوتشی جی۔ یہ لوگ کبھی اچھے بھی ہوں گے۔"

جوتشی جی نے جوڑا لگے پر غور کرنا شروع کیا۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔ پلکوں نے جھپکنا بند کر دیا اور جوتشی جی پتھر کی طرح ساکت ہو گئے۔

راجہ اور رانی ٹکٹکی باندھے بڑی امیدوں سے اس مورت کی طرف دیکھنے لگے۔ وقت گزرتا گیا۔ لیکن جوتشی جی جوں کے توں بیٹھے رہے۔ راجہ اور رانی بھوک پیاس سے بے چین تھے۔ لیکن اس ڈر سے کل تک نہیں بدلتے تھے کہ کہیں جوتشی جی کا دھیان نہ ٹوٹ جائے۔

چڑیوں کی چوں چوں سنائی دی۔ تب رانی کو پتہ چلا کہ سارا دن بیت گیا اور شام ہو گئی۔ رانی گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور اس نے جوتشی جی کی کوٹھڑی کے ایک طرف کے پردے جو آج تک نہیں اٹھائے گئے تھے، اٹھا دیئے۔ سامنے پہاڑوں کی چوٹیاں اور اونچی نیچی چٹانیں تاریکی کی چادر اوڑھے تھیں۔ ہوا ان میں سے سنسناتی ہوئی گزر رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سینکڑوں چڑیلیں ماتمی کپڑے پہنے، آسمان کی طرف سر اٹھائے بین کر رہی ہوں۔ رانی نے گھبرا کر وہ پردے گرا دیئے اور دوسری طرف کے پردے اٹھا دیئے۔ سامنے سارا انوپ نگر روشنی سے جگمگا رہا تھا اور سینکڑوں مشعلیں اِدھر اُدھر ناچتی گھوم رہی تھیں۔ جیسے کسی بہت بڑے پیپل پر کروڑوں جگنو جھلمگ جگمگ کر رہے ہوں۔ باجوں کا شور، گیتوں کی تانیں اور قہقہوں کی آوازیں اگوگل اور چندن کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوا کے ملائم جھونکوں میں لپٹی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔ رانی کے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی انہیں پاگلوں میں سے ایک ہوتی۔ اس نے پلٹ کر جوتشی سے کہا۔

جوتشی جی، ہمارے عوام پاگل نہیں ہیں۔ پاگل ہوں میں۔ پاگل ہے یہ راجہ اور پاگل ہو تم۔ جو سب سے الگ اس کال کوٹھڑی میں پڑے سڑ رہے ہو۔ آگ لگا دو اپنی اس پوتھی کو اور پھونک دو اپنی اس کال کوٹھڑی کو اور چلو ہم تینوں بھی چل کر وہی پانی پی لیں۔"

جوتشی نے چونک کر رانی کو دیکھا۔ اُسے شک ہوا کہ کہیں مہارانی وہ پانی پی تو نہیں چکی ہے۔

راجہ کو رانی کی بات پسند آئی اُس نے کہا۔

"بھگوان کے چرنوں کی قسم، اس مسان کی زندگی سے تو لاکھ بہتر ہے کہ ہم پاگل ہو کر اپنے لوگوں میں گھل مل جائیں۔"

جوتشی جی نے جو راجہ کے منہ سے بھی ایسی بات سُنی تو وہ تلملا گیا جیسے کسی نے اُس کے دل کے پھوڑے کو ناخنوں سے نوچ لیا ہو۔ اُس نے کہا۔

"مہاراج اور مہارانی، آپ کو روکنے کی مجھے مجال نہیں۔ لیکن مجھے معاف کیجئے۔ مجھ سے جیتے جی پاگل نہ بنا جائے گا۔ میں ہمیشہ انسانوں سے دور اس کوٹھڑی میں رہا ہوں اور اب بھی یہیں رہوں گا۔"

راجہ اور رانی باہر چلے گئے اور جوتشی نگر کی طرف سے منہ موڑ کر پہاڑوں کی خاموش چوٹیوں کو دیکھنے لگا۔ ہوا اب بھی کراہ رہی تھی اور رہ رہ کر اُلّو کی چیخیں اور گیدڑوں کے رونے کی صدائیں آتی تھیں۔

راجہ رانی کا ہاتھ پکڑے ہوئے مندر کی سیڑھیوں سے اُتر کر انوپ نگر کی طرف چلا۔ راستہ میں ایک جگہ ایک گڑھے میں موتی کی چمک اور چنبیلی کی مہک والا پانی بھرا تھا۔ دونوں نے چلّوؤں سے وہ پانی خوب سیر ہو کر پیا اور پھر ہنستے کھیلتے ہوئے اپنی پرجا میں مل گئے اور اُن کی رنگ رلیوں میں کھو گئے ۔

(پلاٹ ایک مشہور کہانی سے لیا گیا ہے)

محمد لقمان عباسی خوشنویس لاہور۔